جدید ادب
کے
دو تنقیدی جائزے

سید ابوالخیر کشفی

اردو اکیڈمی سندھ کراچی

جدید ادب
کے
دو تنقیدی جائزے

سید ابوالخیر کشفی

اردو اکیڈمی سندھ کراچی

متن مطبوعہ	انجمن پریس کراچی
کور "	نشاط پریس کراچی
بار اول	اکتوبر ۱۹۶۳ء
تعداد	ایک ہزار

قیمت دو روپے

پنجاب آفس

اردو مرکز

گنپت روڈ۔ لاہور

جدید ادب کے "دو تنقیدی جائزے"

راجندر سنگھ بیدی کی کہانی

"اپنے دکھ مجھے دیدو"

کے نام

ایک بڑی کہانی کے حضور چھوٹا سا نذرانہ

کشفی

ستمبر - ۶۶۲

حرفِ اوّل

تنقیدی مضامین کا مجموعہ پیش کرنے کی جگہ میں نے اس کتابچہ کی اشاعت کو پسند کیا۔ اس کے ذاتی اور ادبی سبب ہیں، ذاتی سبب یہ کہ ابھی میں اپنے مضامین کے مجموعہ کو قبل از وقت سمجھتا ہوں اور اسی لئے پانچ دس سال بعد اپنے آپ سے شرمانا نہیں چاہتا،

ادبی وجہ یہ ہے کہ اُردو ادب کی کوئی اچھی تنقیدی تاریخ اب تک نہیں لکھی گئی اور شاید یہ کام کسی ایک شخص کے بس کا نہیں ـــــ انجمن ترقی اُردو پاکستان اور اورینٹل کالج لاہور نے تاریخ ادب اُردو کے منصوبے ضرور بنائے ہیں دیکھئے یہ تاریخیں کب تک شائع ہوتی ہیں ـــــ جب تک کوئی اچھی تاریخ نہیں لکھی جاتی، ہمارے نقادوں کو ان موضوعات پر کتابیں یا کتابچے لکھنے چاہئیں جن سے انہیں دلچسپی ہو ـــــ یہ کتابیں اور کتابچے مل کر تنقیدی تاریخ اُردو کی کمی کو پورا کر سکتے ہیں ـــــ اُردو میں ایسی کتابیں بہت کم ہیں اسی لئے "ارباب نثر اُردو"۔ "اُردو ادب جنگِ عظیم کے بعد"۔ "شعرائے اُردو کے تذکرے"۔ "ہمارے افسانے" اور "اُردو تنقید پر ایک نظر" وغیرہ جیسی کتابوں اور کتابچوں کی میری نظر میں بڑی وقعت ہے ـــــ یہ کتابچہ بھی اسی نوعیت کا ہے ـــــ میں نے دو تین کتابچے اور لکھے ہیں، کچھ اور لکھنے کا ارادہ ہے مثلاً "اُردو میں خطوط نویسی"، "اُردو سوانح عمریاں"، "اُردو مثنوی پر ایک نظر"، "اُردو مرثیہ"، "اُردو ناول" اور "اُردو افسانہ" وغیرہ۔

پیشِ نظر کتابچے کے دونوں مطالعوں میں میں نے جدید ادبی رجحانات کو پیش کیا ہے اسی لیے اہمیت رجحانات کی ہے ناموں کی نہیں، لیکن یہ رجحانات اپنے ساتھ کچھ نام فوراً ہمارے ذہن میں لاتے ہیں کم و بیش تمام اہم نام ان مطالعوں میں آجاتے ہیں لیکن کچھ ایسے نام یقیناً رہ گئے ہوں گے جنہیں اس جائزے میں پڑھنے والوں کے نقطۂ نظر سے ہونا چاہئے تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے دَور کے ادب کو معروضی طور پر جانچنا اور پرکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ کتنے ہی ایسے لکھنے والے ہوتے ہیں جن کو اپنے دَور میں کئی غیر ادبی وجوہ سے بڑی شہرت اور اہمیت حاصل ہوتی ہے مگر یہ شہرت عارضی اور ناپائیدار ہوتی ہے —— میں نے معروضی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی لئے کئی ایسے ناموں کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ جو زیادہ مشہور تو نہیں لیکن یہ لوگ ہمارے ادب میں خلوص اور کاوش کے ساتھ نئے عناصر کا اضافہ کر رہے ہیں۔ مثلاً جعفر طاہر، اشفاق احمد اور خورشید الاسلام وغیرہ۔

بعض فن کاروں کا مطالعہ اب تک صحیح نقطۂ نظر سے نہیں کیا گیا اور انہیں وہ اہمیت نہ مل سکی جس کے وہ مستحق ہیں اِسی لئے میں نے اس طرف بھی اشارے کئے ہیں مثال کے طور پر اختر الایمان کے بارے میں اِن معروضات کے بعد یہ مختصر جائزے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

ابو الخیر کشفی

دوسری جنگِ عظیم
کا
اثر اُردو شاعری پر

ہر بڑا انقلاب یا بڑی جنگ اِنسانی تمدّن انسانی معاشرت اور انسانی ادب کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے........ اِنقلاب یا جنگ زندگی کے رُخ کو بدل دیتے ہیں۔ انقلابِ فرانس، انگلستان کا غیر خونی انقلاب۔ انقلاب روس اور ۵۷ء کی جنگِ آزادی نے انسانی زندگی کو جس قدر متاثر کیا ہے۔ وہ ظاہر ہے ...... اسی طرح جنگیں بھی اپنا گہرا اثر چھوڑتی ہیں اور زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہوتا ہے..... ۱۴ء کی جنگِ عظیم کو لیجئے۔ اِس جنگ نے قدیم نظامِ حیات کے تار و پود کو بکھیر دیا..... نئے مسائل پیدا ہوئے اور ان مسائل کا عوامی زندگی سے بڑا گہرا ناتہ تھا قحط..... بیماریاں..... افلاس اور دوسری "دخترانِ مادرِ ایام"

ہماری زمین پر چھا گئیں۔ سرمایہ داری اور سامراج نے تشدد کے ہتھیاروں کا سہارا لیا۔ مزدور اور کسان نے بھی اپنی تنظیم شروع کر دی۔ یہ کہنا غلط نہیں کہ ۱۹۱۸ء کے بعد برصغیر ہند و پاک کی تحریکِ آزادی میں بڑی جان پیدا ہو گئی۔

پہلی جنگِ عظیم اور اس کے اثرات یا بعد کے نقوش اُردو شاعری میں نظر آتے ہیں اور آج بھی اُن کے خد و خال دُھندلے نہیں ہوئے ہیں...... اقبال نے "خضرِ راہ" اور "طلوعِ اسلام" جیسی عظیم تخلیقات جنگِ عظیم کے پس منظر میں پیش کیں......

جس وقت ہمارے اچھے خاصے سوچنے والے مجلس آئین و اصلاح کو آزادی کی نیلم پری سمجھ بیٹھے تھے اور "سرابِ رنگ و بو" اُن کو گلستان نظر آ رہا تھا۔

زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے
شباب قوم کا ہے، زور ہوم رول کا ہے (چکبست)

اُس وقت بھی اقبال اپنے آئینہ خانۂ افکار میں آنے والے زمانہ کی سچّی اور حقیقی تصویریں دیکھ رہا تھا...... وہ ہوم رول اور آئین و اصلاحات کے متعلق کیا نظریہ رکھتا تھا؟ — اِس کا جواب اِن اشعار سے سُنیئے، ے

مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِّ مغرب میں مزے میٹھے، اثر خواب آوری
گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

اِن اشعار کا پس منظر "پہلی جنگِ عظیم" ہی ہے لیکن جنگ کا ردِّ عمل اور اُس کے تباہ کُن اثرات کا زیادہ واضح اور صاف ذکر جوشؔ ملیح آبادی کے ہاں ملتا ہے۔ اپنی نظم "زمانۂ جنگ" میں جذباتی جوش ایک ایسا سماجی مفکّر نظر آتا ہے جسے یہ معلوم ہے کہ جنگ سماج پر کیا اثر ڈالتی ہے۔ اور ہماری زندگی کو کس طرح متاثر کرتی ہے۔

یہ جنگ کیا ہے ؟ ایک مجسّم جنون ہے
گلزارِ کائنات کے تھالوں میں خون ہے
خلقت تمام قحط سے بے آب و دانہ ہے
اِس پر وبا کا زور ہے یہ کیسا زمانہ ہے
عالم کے بام و در میں مریضوں کی آہ ہے
دُنیائے طب ہجومِ مرض کی گواہ ہے
(زمانۂ جنگ)

ابھی پہلی جنگِ عظیم کی تخریب کاریوں کے بعد تعمیری منصوبوں کی تکمیل ہی ہو رہی تھی کہ قومیت کے جابر جذبہ اور ملک گیری کی ہوس نے ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم کی لعنت دُنیا پر مسلط کر دی یہ دوسری بڑی لڑائی بھی ختم تو ہو گئی لیکن اُس کے ردِّ عمل سے ابھی تک اِنسانیت نجات نہ پا سکی اور ستم یہ کہ تیسری لڑائی کا خطرہ پھر سامنے ہے۔

دوسری بڑی لڑائی کے بعد انقلابی تحریکیں ہر ملک میں پھیل گئیں۔ عوام جنھوں نے نازیت کے خلاف جنگ کی تھی وہ جنگ کے بعد اپنے حقوق کے لیئے نام نہاد جمہوریت کا نعرہ لگانے والی شہنشاہیتوں کے خلاف سینہ سپر ہو گئے اور جنگ کے زمانہ ہی میں عوام کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر سلطان کا چہرہ بے نور ہو گیا تھا ...... اور عوام کے دباؤ سے مجبور ہو کر استبداد پرستوں کو اپنا غلامی کا جال مشرق کے سمندر سے کھینچنا پڑا۔

اِس دوسری بڑی جنگ کا اثر دُنیا کے ادب پر گہرا پڑا ......
روس کے ادیب اِس عوامی جدو جہد میں پوری طرح شریک تھے، اُنہیں جنگ کو بہت ہی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور وہ خود اس جنگ کے بہادر سپاہی تھے جو اپنے وطن کی حفاظت کے لیئے

میدانِ کارزار میں ٹوٹ پڑے ـــــ روسی ادیبوں نے جو کچھ لکھا اُس میں پروپگنڈائی ادب کے عناصر شامل ہیں۔ لیکن اِس کے لئے ہمیں اُنہیں معاف کرنا ہوگا کیونکہ وہ اُن کے وطن کی قسمت کے فیصلہ کا وقت تھا اور اُن کا وطن اُن سے "ایک لمحہ کے ادب" کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اس کے باوجود روسی ادیبوں نے ایسی چیزیں بھی لکھیں جنہیں ہم ادب العالیہ میں جگہ دینے پر مجبور ہیں۔ "نفرت" "گاؤں" اور "محاصرہ" اچھی روسی تخلیقات ہیں۔

انگریزی ادب اور شاعری بھی اِس بڑی لڑائی سے متاثر ہوئی لیکن انگریزی شاعری میں جنگ کے اثرات اُن اثرات سے مختلف ہیں جو روسی ادب پر اثر انداز ہوئے۔ کرشن چندر نے نئے زاویے کی دوسری جلد میں لکھا ہے کہ "بعض لوگ اچھے ادب کی تخلیق کر رہے ہیں، لیکن ایسا ادب مفقود ہے جو جنگ کے تلخ ماحول کی عکاسی کرتا ہو"...... یہ خیال اپنی جگہ درست سہی لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں کہ جنگ کی عکاسی انگریزی شاعری میں نہیں ہے، انگریزی ادب اور شاعری میں وہ شدّتِ احساس اور جذباتیت نہ سہی جو زمانۂ جنگ کے روسی ادب میں ہے اور نہ انگریز شاعروں نے جنگ کو موضوعِ سخن بنایا لیکن زمانۂ جنگ میں بیشتر انگریزی شاعروں

کی تخلیقات کا پس منظر "جنگ" ہی ہے اور جنگ کا سایہ بشیتر نظموں پر نظر آتا ہے اِسی لیے ان نظموں میں زیادہ سنبھلی ہوئی کیفیت ملتی ہے۔ جنگ کے اثرات کے باوجود انگریزی شاعری "سیاست کا ضمیمہ" نہیں بن گئی۔ زمانۂ جنگ کی انگریزی شاعری میں "زندگی" اور "قوم" کا بیدار شعور موجود ہے۔ انگریز ادیب اور شاعر بھی اپنی قوم کے دوسرے سپاہیوں کے ساتھ نازیوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ Alan Lewis, Rolly

Fuller, Sydney, Keyes

ایسے ہی شاعر ہیں, Keyes اور Lewis تو دشمنوں کے ہاتھوں مارے گئے اُنھوں نے جنگ سے متعلق قابلِ ذکر نظمیں لکھی ہیں۔ انگریزی شاعری پر دوسری بڑی جنگ کا جو اثر پڑا ہے وہ Ross سے سُنیئے۔

"The experience of war created a deeper need for the understanding of our age and of what went on beneath the surface of events; people became more interested in the process of feeling and the issues which had hecame so

much part of their life. In fact they became more intense by consious of living and of themselves. It was the poet that most ably provided this X ray."

اُردو ادب اور اُردو شاعری پر بھی دوسری بڑی لڑائی کا گہرا اثر پڑا ــــــ جنگ کا یہ اثر براہ راست نہ سہی اور بالواسطہ سہی لیکن اس بنا پر یہ کہنا غلط ہوگا کہ "جنگ ہندوستان کے لئے بڑی حقیقت نہیں رہی ہے"...... ہندوستان جنگ کے شعلوں سے محفوظ ضرور رہا لیکن یہ شعلے ہندوستان کے دروازے تک پہنچ گئے تھے اور جنگ کے اِن بالواسطہ اثرات نے ہندوستان کی تاریخ کے سب سے بڑے قحط کو جنم دیا...... وہ قحطِ بنگال جس کا تمام ترکرب کرشن چندر کے "ان داتا" میں موجود ہے...... جنگ کے موضوع پر اُردو افسانہ میں ہم کو ایک غیر فانی اور اَبدی شاہکار بھی ملتا ہے اور وہ احمد ندیم قاسمی کی تخلیق "ہیروشما سے پہلے اور ہیروشما کے بعد" ہے...... یہ تخلیق اس بات کی تردید کرتی ہے کہ جنگ کا اثر اُردو ادب پر بڑا سطحی پڑا ہے۔ ندیم قاسمی کی تخلیق

پڑھنے والے کے ذہن پر یہ صحت مند اثر چھوڑتی ہے کہ جنگ پر انسان کو فوقیت حاصل ہے۔ یہ شاہکار محض رپورٹنگ نہیں ہے اس میں صرف نفرت کا اظہار ہی نہیں ہے، اس میں نازیوں کو گالیاں نہیں دی گئی ہیں بلکہ انسانی زندگی پر جنگ کے اثر کو بڑی حُسن کاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور اس میں جو سنبھلی ہوئی کیفیت ہے وہ روس کے پروپگنڈائی اسلوب سے زیادہ گہری چیز ہے۔ روس میں زمانۂ جنگ میں جو ادب پیش کیا گیا وہ سب کا سب نہ سہی لیکن اس کا بڑا حصّہ محض پروپگنڈا ہے

پس منظر کو اُجاگر کرنے کے لئے اور اپنے موضوع کو زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کے لئے مجھے روسی ادب، انگریزی شاعری اور اُردو افسانہ نگاری سے متعلق بھی کچھ اشارے کرنے پڑے، آیئے اب اُس شاعری کا تجزیہ کریں جس میں دوسری جنگِ عظیم کی داستان بکھری ہوئی ملتی ہے۔

اُردو شاعری میں زمانۂ جنگ میں قابلِ قدر اضافے ہوئے لیکن جنگ کے موضوع پر بہت کم اچھی نظمیں کہی گئیں —— نظموں کی تعداد بھی تسلی بخش نہیں ہے، اگرچہ حکومت کے شعبۂ نشر و اشاعت سے متعلق ہو کر حفیظ جالندھری اور دوسرے شعراء نے پروپگنڈائی

گیت اور نظمیں لکھیں لیکن ان کا معیار اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا کہ "میں اپنے چھورے کو بھرتی کرا آئی رے" —— یہ جنگ یقیناً فاشزم اور جمہوری طاقتوں کے درمیان تھی لیکن جب ہندوستانی عوام اور اُن کے شاعر اپنے پیروں میں غلامی کی زنجیروں کو دیکھتے تھے تو اُن میں اُداسی کی لہر پھیل جاتی تھی بلکہ ہندوستانی سیاست داں تو اس جنگ اور انگریزوں کی مجبوری سے فائدہ اُٹھا کر ہندوستان کے لئے آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے یہی جذبہ اگر ایک طرف آزاد ہند فوج کے قیام میں نظر آتا ہے تو دوسری طرف اگست ۴۲ء کی تحریک میں ملتا ہے لیکن روس کی شرکتِ جنگ نے اُردو شاعروں اور ادیبوں کے رویّہ (Attitude) کو کافی بدل دیا تھا اور اسی تبدیلی کا نتیجہ تھا کہ مخدوم نے اِس جنگ کو "جنگِ آزادی" کا نام دیا —— بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے بیشتر شاعروں کے نزدیک یہ جنگ وہ کچھ نہ بن سکی جو روسی ادیبوں کے لئے تھی اور اُس کی وجہ ظاہر ہے —— اگست ۱۹۳۹ء میں جوشؔ ملیح آبادی نے اپنی نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام" لکھی جو بڑی تیزی کے ساتھ ہر طرف پھیل گئی اور دبی دبی سرگوشیوں میں ہر گلی اور کوچے میں سُنائی دینے لگی - جوشؔ یقیناً اِس حقیقت

سے آگاہ تھے کہ فاشزم کی شکست ہر قیمت پر ضروری ہے کیونکہ فاشزم ایک کوہِ آتش فشاں تھا اور ساری انسانیت اُس کی زد میں تھی۔ اِنسانی تہذیب خطرے میں تھی اس کے باوجود جب وہ یہ سُنتے تھے کہ اتحادی اور انگریز انسانی تہذیب کی بقا کا نعرہ لگاتے ہیں تو وہ کھول اُٹھتے تھے اور برطانوی راج کے ڈیڑھ سو سالہ مظالم کی کہانی اُن کے حافظہ میں اُبھرنے لگتی تھی اور وہ یہ سوچنے لگتے کہ انسانی تہذیب و تمدن کے یہ سب سے بڑے قاتل آج کِس مُنہ سے انسانی تہذیب و تمدّن کی بقا کا نعرہ بلند کر رہے ہیں اُن کی نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام" میں وہ گہرا بھرپور دیرپا اور تمثیلی طنز نہیں ہے جو "وفادارانِ ازلی کا پیغام شہنشاہِ برطانیہ کے نام" میں ہے اس کے باوجود شاعرانہ جوش اور خروش جو جوشؔ کی شاعری کا ایک حصّہ ہے اس نظم میں پوری طرح موجود ہے نظم کی ابتدا اِس شعر سے ہوتی ہے ؎

کِس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو

اور پھر ؎ سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمہاری اور یہ ذکر
نوعِ انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر

اور پھر سامراجیوں کے جمہوری نعروں اور اعلان پر اِس طرح طنز کیا ہے ؂

دیر سے بیٹھے ہو نخلِ راستی کی چھاؤں میں
کیا خدا ناکردہ کچھ موچ آگئی ہے پاؤں میں
آج کل تو ہر نظر میں رحم کا انداز ہے
کچھ طبیعت کیا نصیبِ دشمناں ناساز ہے؟
سانس کیا اُکھڑی کہ حق کے نام پر مَرنے لگے
نوعِ انساں کی ہوا خواہی کا دَم بھَرنے لگے

"فاشزم" کو شکست تو یقیناً ہونی چاہیے تھی لیکن اِس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جن سامراجی طاقتوں نے نوعِ انسانی کی ہوا خواہی کا دم زمانۂ جنگ میں بھرا تھا وہ محض مصلحت تھی اور جنگ کے خاتمہ کے بعد دُنیا نے دیکھ لیا کہ "آزادی، امن اور مساوات" کا نعرہ لگانے والے مشرق میں اپنے اقتدار کی خاطر انسانی اقدار کو کچلنے پر آمادہ ہو گئے۔ اینگلو امریکن بلاک آج بھی مشرق کے لئے سیمیں جال پھیلائے بیٹھا ہے۔ ایک طرف امریکن ڈالر ہیں اور دوسری طرف نوآبادیات کی آزادی کا مسئلہ اِس بلاک کی تمناؤں کے برخلاف۔ چین میں تو عوامی انقلاب کامیاب

ہو گیا لیکن "ویٹ نام"۔ "فلسطین" اور "کشمیر" کے مسائل کو جس طرح اُلجھایا گیا ہے وہ مفاد پرستی کا بدترین نمونہ ہے۔ مخمور جالندھری کی نظم "مگر مچھ کے آنسو" بھی اِس دَور کی ممتاز طنزیہ نظم ہے، جب ہندوستان میں مسجدوں، مندروں اور گرجاؤں میں اتحادیوں کی کامیابی کے لئے دعائیں کی گئیں تو شاعر کو اُس مذہب اور مگرمچھ کے آنسوؤں میں بڑی مماثلت نظر آئی۔

"رومانی انقلاب" کا شاعر مجاز بھی آہنگ نو سناتا ہوا آیا۔

"اے جوانانِ وطن روح جواں ہے تو اُٹھو"......اُس کی نظم کا انداز بھرپور تھا لیکن اس میں جلال وجمال کا وہ امتزاج نہیں جو اُس کی شاعری کا امتیازی پہلو ہے اور نظم کے بہت سے بند "پروپگنڈا" کی نذر ہو گئے لیکن اس نظم کے ایک مصرع میں "آوارہ" "اعتراف" اور "نوجوان خاتون سے" کا شاعر اپنے پورے رچاؤ کے ساتھ گنگنا ہی اُٹھا ہے

"پاسِ ناموسِ نگارانِ وطن ہے تو اُٹھو"

جوانانِ وطن کو شرکتِ جنگ کی دعوت دیتے ہوئے ناموسِ نگارانِ وطن کا واسطہ دے کر مجاز نے "رومانی انقلاب" کی شاعری کا اچھا نمونہ پیش کیا ہے اور یہ واسطہ نوجوانوں کے لئے کارگر بھی ہے۔

جنگ اور انقلاب کے درمیان جو رشتہ ہے اُس کو علی سردار جعفری نے اپنی نظم "جنگ اور انقلاب" میں پیش کیا ہے..... شاعر کی نگاہوں نے اس بات کو دیکھ لیا اور اُس کے ادراک نے اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ اس جنگ کے ساتھ عوامی انقلابات بھی وابستہ ہو گئے ہیں اور یہ جنگ سامراج اور تختِ شاہی پر ضرب کاری ہے ـــــ دوسری بڑی جنگ کو "وقت کی رفتار کا مڑتا ہوا دھارا" کہہ کر جعفری نے اس کی اہمیت اور اس کے اثرات کا احاطہ بڑی کامیابی کے ساتھ کر لیا ہے ؎

ہل چکا ہے تختِ شاہی گر چکا ہے سر سے تاج
ہر قدم پر ڈگمگایا جا رہا ہے سامراج
ڈھل رہی ہے زرگری کی رات کے تاروں کی چھاؤں
مفلسی پھیلا رہی ہے وقت کی چادر میں پاؤں
انقلابِ دہر کا چڑھتا ہوا پارا ہے جنگ
وقت کی رفتار کا مڑتا ہوا دھارا ہے جنگ

مخدوم محی الدین نے "سپاہی" اور "اندھیرا" میں اسی دوسری جنگ کی عکاسی کی ہے "اندھیرا" کی ابتدا جس خوبصورت انداز سے ہوئی ہے اُس کی مثالیں اردو نظم آزاد میں کم ہی ہیں! الفاظ

کا انتخاب اور اشاریت دونوں چیزیں ابدیت بداماں ہیں لیکن ابتدا کے فوراً ہی بعد نظم کا توازن بگڑ گیا، ترنم باقی نہ رہا مصرعوں میں بڑا انتشار پیدا ہو گیا...... نظم کا خاتمہ بھی بہت ہی اچھا ہے...... لیکن درمیانی حصّہ نے اس نظم کو شدید طور پر مجروح کیا ہے "اندھیرا" کی ابتدا اِن مصرعوں سے ہوتی ہے۔

رات کے ہاتھ میں اِک کاسۂ دریوزہ گری
یہ چمکتے ہوئے تارے یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں، مانگے کے اُجالے میں مگن

اور خاتمہ بھی اتنا ہی اچھا ہے۔ بلکہ زیادہ اچھا۔

رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں۔

"آزردہ ستارے"۔ "رات"۔ "اندھیرا"۔ "خورشید درخشاں"..... یہ سب بڑے ہی بامعنی اشارے ہیں.....

اختر انصاری جن کے رومانی قطعات نے نوجوانوں کے سینوں میں درد و کرب کی شمعیں روشن کی ہیں اُنہوں نے بھی جنگ کی عکاسی سے دامن کشی نہیں کی "وہ انجم و مہتاب، نغمہ و سرور، بہار و گلزار اور

رنگ و نکہت" کے شیدائی تھے اور اُنہیں "ایسا محسوس ہوا کہ ساری حُسن بھری کائنات آگ اور خون کے سیلاب میں غرق ہو جانے کو ہے اور اس احساس نے اس دردناک نغمہ کی تخلیق کی۔ ۵

ہے نغمہ سرا نغمۂ نیم رنگ ‌ ‌ ‌ مرا جام مستی بھی خالی ہے آج
ابھی تک ہے کیوں چاندنی سیم رنگ ‌ ‌ ‌ زمینِ چمن خوں سے ہے سرخ پوش

یہ اشعار شخصی ہیں۔ اور ان میں اجتماعیت کا زیادہ شدید احساس نہیں۔ شاعر کو بڑا دُکھ یہ ہے کہ اُس کے نغموں کا رنگ پھیکا پڑ گیا ——— اجتماعیت کا شدید احساس نہ ہوتے ہوئے بھی اِن اشعار میں شاعری بھی موجود ہے اور کرب بھی ——— کم از کم اس مصرع کی ترکیب اور اس کا خیال متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ——— "ابھی تک ہے کیوں چاندنی سیم رنگ" لیکن ان شعروں میں جنگ کا بُنیادی پہلو شاعر کے پیشِ نظر نہیں رہا ہے اور اُس نے جنگ کا مطالعہ سیاسی اور سماجی پس منظر میں نہیں کیا بلکہ خود اختر انصاری کے الفاظ میں یہ شاعر کا ایک فوری ردِّعمل تھا۔ محض ایک شاعرانہ احساس۔ سیماب اکبرآبادی نے جنگ کو بطورِ خاص اپنا موضوع بنایا ——— اُنھوں نے دوسری جنگِ عظیم پر تین سو سے زیادہ رباعیاں لکھیں جو "عالم آشوب" کے نام سے شائع ہوئیں۔ شہر آشوب کی قدیم روایت میں اضافہ

ہوا اور اس سے اُردو شاعری کی ایک اہم تبدیلی کا اندازہ ہوتا ہے - سیماب کی رباعیوں میں تفکر بھی ہے، شاعرانہ رنگ و آہنگ بھی لیکن کہیں کہیں برِ صغیر کی تحریکِ آزادی کا مذاق اُڑایا گیا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ یہ رباعیاں حکومت کی جانب سے شائع کی گئی تھیں -

غزل گو فراق کی غزلوں پر بھی دوسری بڑی جنگ کی پرچھائیاں پڑیں ـــــ ان کی کئی غزلوں میں تسلسل کے ساتھ جنگ کے اثرات بھی ملتے ہیں لیکن اُن کے یہاں "جنگ" کی عکاسی ہے کسی فریق کا پروپگنڈا نہیں اور اُن کی یہی اشاریت علی سردار جعفری کے نزدیک شاعری کے منافی ہے (نہ جانے لوگ اشاریت کو اتنا بُرا کیوں سمجھتے ہیں)

وہ سر اُٹھائے موجِ فنا آرہی ہے آج
موجِ حیات موت سے ٹکرا رہی ہے آج
کانوں میں زلزلوں کی دھمک آرہی ہے آج
ہر چیز کائنات کی تھرا رہی ہے آج
ہر ہر شکستِ ساز میں صد لحنِ سرمدی
یا زندگی کے گیت اجل گا رہی ہے آج

فراق کے آخری شعر میں سچی شاعری ملتی ہے ...... یہ جنگ،

یقیناً انسانی خون کی ہولی تھی اور ہر طرف فضا میں موت کے پھریرے لہرا رہے تھے لیکن نئی زندگی کے لئے فاشزم کی موت ضروری تھی اور اسی چیز کو فراقؔ نے یوں کہا کہ "یا زندگی کے گیت اجل گا رہی ہے آج" اور دوسرے مصرع کا پہلے مصرع سے گہرا تعلق ہے.........

اخترؔ انصاری کی نظم "مونا لیزا" اُردو میں جنگ پر لکھی ہوئی کامیاب ترین نظموں میں سے ایک ہے ـــــ سنکہء کے موسم گرما میں فرانس کی شکست ایک بڑا سانحہ تھی...... ایک ایسا سانحہ جس نے سب ہی کو متاثر کیا۔ اگر ایک طرف چرچل کی تقریروں کا ادبی رنگ حد درجہ نکھر گیا اور اُس نے سقوطِ فرانس کے بعد فرانس والوں کو یہ پیغام دیا کہ۔

"Good night then. Sleep to gather strength for the morning. For the morning will come. Brightly will it shine on the brave and true. Kindly upon those who suffer for the cause, glorious upon the tombs of heroes. Thus will shine the dawn."

تو دوسری طرف ادیبوں اور شاعروں پر بھی اس حادثہ نے اثر ڈالا ـــــ روسی ادب میں "سقوط پیرس" جیسی چیز لکھی گئی اور اُردو میں اختر انصاری نے "مونا لیزا" لکھی اس نظم میں ذاتی تاثر بھی ہے اور تمدّنی شعور بھی .... فرانس کی شکست سیاست دانوں کی بہ نسبت ادیبوں اور شاعروں کے لئے زیادہ بڑا حادثہ تھی کیونکہ فرانس صدیوں سے تہذیب و تمدن کا نشان رہا ہے اس سرزمین سے ثقافت، ادب اور تمدن وابستہ رہا ہے، یہ رومانی سرزمین ادیبوں کے لئے خوابوں کا جزیرہ رہی ہے ـــــ اختر انصاری نے مونا لیزا کو ایک وسیع اشارہ بنا دیا ہے اور اِس اشارہ کے انتخاب کی وجہ اُن کے اپنے الفاظ میں یہ ہے کہ "مونا لیزا اطالوی مصوّر لیونارڈو کا شاہکار، اور دُنیا کی مشہور ترین تصویر، جو پیرس کی پکچر گیلری کی ملکیت اور زینت ہے، گویا فرانسیسی کلچر کا نشان رہا ہے یہ گویا علامت ہے اُس ذہنی برتری کی جو ذہن و دماغ، علم و ادب اور فنِ ثقافت کی دُنیا میں فرانس کو روئے زمین کے دوسرے خطوں پر حاصل ہے۔ شاعر نے کلچری ترقی کے اسی نشان اور فنی عظمت کی اسی علامت کو اپنا مخاطب بنایا اور اس فن کارانہ تخاطب کے پردے میں انسان کی ہلاکت اور انسانی ذہن کی اہانت پر آنسو بہائے

ہیں"..... لیونارڈو کے شاہکار مونالیزا کا تبسّم ہی اُس تصویر کا حاصل ہے اور اسی تبسّم کی تکمیل کی خاطر فن کار نے اپنی زندگی کے کتنے سال گزار دیئے۔ آخترؔ کی نظر نے اس تبسّم کا پورا احساس کیا ہے اور اسی کو نظم کی بنیاد بنایا ہے ؎

یہ تبسّم کہ ہے بہت شیریں — زندگی کی مٹھاس ہے، مانا
موت پر فتح حُسن کی ہے۔یہ — اور تمدّن کی آس ہے، مانا

مگر افسوس اے حسیں شہکار! — خود تمدّن ہے آج خاک بسر
خون میں لتھڑی لاش ہے تہذیب — زندگی کی ہے لاج خاک بسر

آج تو اِس حَسیں تبسّم میں — کوئی تاثیرِ زہر ہی ہوتی
اور اگر وہ نہیں تو کم سے کم — طنز کی ایک لہر ہی ہوتی

سنہ۱۹۴۱ء کے موسمِ گرما میں جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا... اور یہیں سے اُردو کے جنگی ادب کا نیا موڑ شروع ہوتا ہے..... اُردو کے بعض محتاط شاعروں نے اب تک جنگ سے بے تعلقی برتی تھی اب ان کے قلم اور اُن کے ذہن نے جنگ سے اپنے آپ کو وابستہ پایا، اس کے علاوہ اُردو کے اشتراکی شاعروں اور ادیبوں نے

تو قلمی جہاد شروع کر دیا۔ مخدوم محی الدین، سردار جعفری، کیفی، اعظمی اور ساحر لدھیانوی یہ سب اِسی جہاد میں مصروف نظر آتے ہیں ......
ان اشتراکی شاعروں کے علاوہ اختر انصاری، احمد ندیم قاسمی، جاں نثار اختر اور مسعود اختر جمال نے بھی اس دَور میں نظمیں کہیں ______ ۱۹۴۷ء میں اور اس کے بعد جو کچھ لکھا گیا اُس کا انداز زیادہ واضح اور سُلجھا ہوا ہے کیونکہ وہ شاعر جو شہنشاہیت کے خلاف تھا جو بڑی حسرت سے یہ دیکھ رہا تھا کہ قافلے صدیوں سے لُٹتے رہے ہیں یہ "چاند بجھتے رہے ہیں" ...... "زندگی خستہ و درماندہ و مجبور" رہی ہے جب اُس نے دیکھا کہ "ایک دریچہ کھڑکا" اور ایک "سُرخ سی شمع" بڑھی تو اُس کے فن میں "شفقِ سُرخ" کا نکھار آگیا........ سوویت جرمن جنگ نے اُردو شاعروں کے تذبذب کو ختم کر دیا اور انہوں نے فاشسٹوں کی تہذیب سوزی اور تمدن دشمنی کو اچھی طرح سمجھ لیا کیونکہ یہ فاشسٹ انسانی تمدن کے مظاہر کو تباہ و برباد کر رہے تھے، مصنفوں سے اُن کے قلم چھین لئے گئے، مفکرین کے دماغوں پر پہرا بٹھا دیا گیا، انسانی برتری کے نقیبوں کی زبانوں پر تالے ڈال دیئے گئے، دانش وروں کو اُن کے وطنوں سے نکال دیا گیا، سائینس دانوں کے لئے اُن کا علم مصیبت بن گیا اور انہیں گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا، کتب خانوں،

عجائب گھروں اور تصویر خانوں سے آگ کے شعلے بلند ہوئے....
اِن سب باتوں نے اُردو شاعروں کو بھی مجبور کر دیا کہ وہ اِنسانی تمدّن و تہذیب کی بقا کے لئے دُنیا کے دوسرے ادیبوں کے قلمی محاذ میں شامل ہو کر اُسے مضبوط تر بنائیں ——— سویت اور جرمن جنگ کے ساتھ ہی دوسری بڑی لڑائی کا نقشہ بھی بدل گیا ——— اِتحادیوں کے قدم فتح کی طرف بڑھنے لگے اور فاشزم کا زوال شروع ہو گیا۔ روس کے میدانوں میں جرمنی کی طاقت نے دم توڑ دیا۔ ابتدا میں جرمنوں نے روس کے کئی دفاعی محاذوں کو برباد کر دیا لیکن اِن دفاعی مراکز کے کھنڈروں میں جرمنی کی طاقت کی لاش دفن کر دی گئی...... فاشزم کی شکست نے ہمارے شعراء کے آہنگ میں احساس کامرانی پیدا کر دیا۔ اُن کی نظموں میں ترنّم اور رقص ملنے لگا، بلند آہنگی نظر آنے لگی اور ادب میں رجائیت کا جلوہ نظر آنے لگا

مخدوم محی الدین نے تاتار کے عوامی شاعر جابر کی نظم "اسٹالین" کا ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ بہت کامیاب ہے۔ اس میں بڑا جوش و خروش ہے لیکن یہ شاعر کی اپنی **Original** تخلیق نہیں اسی لئے اپنی خوبیوں کے باوجود ہمارے مطالعہ کے دائرہ سے باہر ہے۔

احساسِ کامراں کے عنوان سے مسعود اختر جمال اور ساحر لدھیانوی نے نظمیں لکھیں لیکن ان دونوں کے اسلوب اور نظریات میں بڑا فرق ہے۔ دونوں نظمیں جس طرح شروع ہوئی ہیں اُن سے یہ فرق واضح ہو جاتا ہے۔

تجھے مسافرِ شب سوچ کیا ہے، فکر ہے کیا (اختر جمال)

اُفقِ روس سے پھوٹی ہے، نئی صبح کی ضو (ساحر لدھیانوی)

مسعود اختر کی احساسِ کامراں کا Scope اور Canvas ساحر کی احساسِ کامراں سے زیادہ وسیع ہے..... یہ مسافرِ شب انسان ہے جو جنگ کی شبِ تار میں فریبِ راہ کا شکار ہو گیا لیکن شاعر اُسے یقین کا سبق دیتا ہے کہ فریبِ راہ نشانِ منزل کو نگاہوں سے نہیں چھپا سکتا...... اور "موجِ ساحل" "غمِ حیات سے" دُور نہیں ہو سکتا —— شاعر کو انسانی تجربوں اور ارتقائے تمدن پر پورا پورا بھروسہ ہے ؎

نقوش تیرے زمانہ مٹا نہیں سکتا
یہ ارتقائے تمدن بُھلا نہیں سکتا

نظم کے دوسرے بند میں ایسی اچھی شاعری تو نہیں ملتی لیکن پھر بھی شاعر پر نعرہ بازی کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا —— وہ فسطائیت

اور نازیت کو نادر و چنگیز کا اثر سمجھتا ہے اور انہیں تحریکوں کے لئے طوفانِ روزگار کا شاعرانہ اشارہ استعمال کرتے ہوئے اِس اُمید افزا مصرع پر نظم کو ختم کرتا ہے ؎

"حریفِ ظلمتِ شب، آفتاب ہوگا ضرور"

ساحر کی نظم بھی کامیاب ہے لیکن مسعود اختر جمال کی طرح اُس کی فکرِ انسان اور ارتقائے تمدن کا احاطہ نہیں کرتی بلکہ وہ صرف مُورخ سیل کی بے باکی کو دیکھتا ہے...... سردار جعفری اور کیفی اعظمی کی اس قسم کی نظموں میں شاعرانہ روح کہیں نظر نہیں آتی اور اسی لئے وہ شاعرانہ روح کا مذاق اُڑاتے ہوئے نعرہ بازی کو کھری شاعری کا نام دیتے ہیں لیکن ساحر کی نظم احساس کامراں میں یہ دکھری، شاعری موجود ہے شدتِ احساس، شاعر کا پر اعتماد لہجہ اور شاعرانہ ترنم یہ سب چیزیں گھل مل گئی ہیں۔

سنگ و آہن کی چٹانیں ہیں عوامی جذبے
موت کے رینگتے سایوں سے کہو ہٹ جائیں
کروٹیں لے کے مچلنے کو ہے سیلِ انوار
تیرہ و تار گھٹاؤں سے کہو ہٹ جائیں

بیا

عرصۂ دہر پہ چھائی ہوئی کرنوں کی قسم
عرصۂ دہر پہ اب شام نہیں چھا سکتی

اور اس طرح شاعر نے سرخ طوفان کو کافی شاعرانہ اور خوشگوار بنا دیا ہے۔

اختر انصاری نے بھی اپنے قطعات کے ذریعہ جنگ کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی ہے اختر انصاری کے قطعات اُردو شاعری میں ایک بلند جگہ رکھتے ہیں لیکن جنگ سے متعلق اُن کے قطعات میں اُن کا خاص رنگ نہیں جھلکتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کی داخلی شخصیت اُس کے خارجی تجربات سے ہم آہنگ نہیں ہوسکی ہے اور اُس کا موضوع اُس کی شخصیت کا عنصر نہیں بن سکا ہے اور اُس کے تجربات اُس کے ذہن میں رچ بس نہیں سکے ہیں اسٹالن گراڈ کی تباہی پر اُنہوں نے یہ قطعہ لکھا ہے

خاک و خوں کا ڈھیر ہیں، خاشاک کا انبار ہیں
سارے ایوانِ فلک فرسا اسٹالن گراڈ کے
مُسکرا کر کان میں کہتا ہے، کوئی، یہ کھنڈر
نازیت کے کھنڈر ہیں یا اسٹالن گراڈ کے

اس قطعہ سے میرے اِس خیال کی تصدیق ہوسکتی ہے کہ اختر

اپنے موضوعات کے ساتھ خلوص نہیں برت سکے۔

جس طرح "مونا لیزا" فرانس سے متعلق بہترین نظم ہے اُسی طرح جنگ کے اِس دَور سے متعلق احمد ندیم قاسمی کی نظم "شفقِ سرخ" سب سے اچھی نظم ہے۔ شاعر کے حُسن کارانہ ذہن اور اُس کے فنی نظریات کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اُس نے نظم کا عنوان "سرخ طوفان" نہیں بلکہ "شفقِ سُرخ" رکھا ہے۔ میرا یقین ہے کہ یہ عنوان شعوری ہے اور ندیم کی تعمیری ذہنیت کا مظہر .... اس کے علاوہ شفق حُسن کا اشارہ بھی ہے جو آنے والی زندگی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اس نظم میں کہیں نعرے نہیں ملتے "روس" کا نام نہیں ہے بلکہ ابن آدم کی عظمت کے گیت ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ کہیں سردار جعفری صاحب اس نظم کو بھی مبہم قرار نہ دے دیں۔ ایسے نقاد یہ بھول جاتے ہیں کہ ادیب اشاریت کے ذریعہ ہنگامی موضوعات کو آفاقی بنا دیتا ہے۔ اشاریت ہی میں فنی ابدیت پوشیدہ ہوتی ہے ——— آج موضوعات تو ایک ہی سے ہیں اور اس کی وجہ ہماری عوامی زندگی کے مسائل کی ہم آہنگی ہے لیکن فن کار کا فنی Treatment ہی ادبی تخلیقات میں بڑائی پیدا کرتا ہے۔ جس بات کو ساحر لدھیانوی یوں کہتے ہیں کہ:

اُفقِ روس سے پھوٹی ہے نئی صبح کی ضو　　　شب کا تاریک جگر چاک ہوا جاتا ہے

اُسے ندیم قاسمی نے یوں کہا ہے کہ

اِک نئے دَور کا پرتو ہے اُفق کی لالی

اِک نئے حُسن کی خاطر یہ حنا بندی ہے

کیا "اُفق کی لالی"۔ "نیا دور"۔ "نیا حسن" اور "حنا بندی" کے اشارے مُبہم ہیں؟ سیاست ہمارے ادب کا حصّہ ہے اور شعر بھی اس سے الگ نہیں رہ سکتا لیکن مقرّر کی لغت علیحدہ ہوتی ہے اور شاعر کی لغت جداگانہ ہوتی ہے اور اس بات کو سمجھے بغیر ہم اچھی اور بُری شاعری میں فرق نہیں کر سکتے اور اپنی سخن ناشناسی کو شعر و ادب کی نئی بنیادوں کا حسین نام دینا پڑتا ہے۔

اس نظم کے ایک بند میں صدیوں کی اِنسانی بے بسی اور مجبوری کی بڑی ہی زندہ، شاعرانہ اور متحرّک تصویر ہے اور ایک بند میں اشتراکیت کو "شوخ سی شمع" کہہ کر شاعر نے ہمیں چونکا دیا ہے اور افادیت کا نیا ادبی تصوّر اور انداز دیا ہے "طوفان" خواہ تیرگی کو بہانے کے لئے آگے بڑھے لیکن تعمیر کے ساتھ تخریب بھی طوفان سے وابستہ ہے۔ مگر شمع تو نئے صبح کی مُغنّی ہے۔ اُس کا سوز و گداز ہی شب تاریک جگر چاک کر دے گا۔ طوفان و سیلاب دلیل کی کیا حاجت؟

اب دونوں بند ملاحظہ ہوں ؎

حُسن بکتا رہا زربفت کے پردوں سے اِدھر
عشق سُنتا رہا بجتے ہوئے فولاد کا شور
قافلے لُٹتے رہے منزلیں بیگانہ رہیں
چاند بُجھتے رہے، تکتے رہے محبوس چکور

ناگہاں ایک دھواں دھار دریچہ کھڑکا
شوخ سی شمع بڑھی لَو کی زباں لہراتی
سرسراتی ہوئی ظلمت کے نشیبوں سے اُٹھی
شفقِ سُرخ، نئی صبح کے نغمے گاتی

جاں نثار اختر بھی خاموش نہیں رہے اور اُنہوں نے اِس دَور میں ایک نظم "سرخ فوج" لکھی۔ جہاں تک الفاظ کا سوال ہے یہ کافی خوب صورت نظم ہے اور تاثراتی اعتبار سے بھی کامیاب ہے۔ نظم میں صوتی آہنگ بھی ہے لیکن نظم محض سُرخ فوج کی قصیدہ خوانی ہے یا ایک منظر جیسے شاعر سُرخ فوج کی مارچنگ سے متاثر ہوا ہو — معنوی طور پر اس نظم کا کوئی مرکزی خیال نہیں ہے یہ نظم کانوں کو یقیناً اچھی معلوم ہوتی ہے لیکن سوچنے کی دعوت نہیں دیتی — دو بند ملاحظہ ہوں۔ میرے خیال میں دوسرا بند نظم کا سب سے اچھا بند ہے ؏

حرّیت کے پاسباں — زندگی کے رازداں
جنگ جو اجری جواں — ایک سُرخ کہکشاں
یہ کُدال یہ نشاں — ہل رہا ہے کُل جہاں
جُھک رہا ہے آسماں
سُرخ فوج ہے رواں

ایک موجِ کارزار — ایک سُرخ جوئبار
ایک تُند آبشار — ایک ابرِ کوہسار
اِک شہابِ بے قرار — اِک تلاطمِ شرار
شعلہ خیز و شعلہ باز
سُرخ فوج ہے رواں

"سُرخ فوج" کے عنوان سے سیّد فیضی نے بھی ایک نظم لکھی ...... یہ نظم لفظی اعتبار سے جاں نثار کی نظم کی طرح شگفتہ نہیں ہے لیکن اس میں جو صوتی کیفیت اور اُتار چڑھاؤ ہے وہ جاں نثار کی نظم میں نہیں ہے .... جاں نثار نے سُرخ فوج کے لئے جو بھی الفاظ استعمال کئے ہیں وہ معنوی طور پر سُرخ فوج کی کسی صفت کی طرف اشارہ نہیں کرتے ہیں بلکہ صرف شاعر کے احساس اور اُس کے تاثر کو پیش کرتے ہیں لیکن فیضی کی نظم میں سُرخ فوج کے کردار کی طرف

بھی اشارہ کرنے والے الفاظ موجود ہیں "تازہ دم"، "بے سکوں"
"جہاں گرد" ؂

جواں نصیب تازہ دم — سُبک عناں سُبک قدم
رواں دواں ہے فوج سرخ
"اُمیدِ کارواں"، کی اِک اُچٹتی جنبش نظر
سپاہیوں کے واسطے نشانِ مرگ و زیست ہی
ابھی یہاں ہے قافلہ، ابھی وہاں ہے قافلہ
شگفتہ عزم، بے سکوں
مگر یہ اُن کی ریت ہے

سردار جعفری اور کیفی اعظمی نے کئی نظمیں لکھیں —— کیفی کی نظموں میں بڑی سطحیت ہے اور کھُلی جذباتیت ہے۔ اُن کی نظم "نازیوں کا اعترافِ شکست"، اِس طرح شروع ہوتی ہے ؂

روس میں مکر کے ہم جال بچھائیں کیونکر
ناؤ کاغذ کی سمندر میں چلائیں کیونکر
رنگ اُڑتے ہوئے شعلوں پہ چڑھائیں کیونکر
پاؤں بجلی کے خزانے پہ جمائیں کیونکر
روس میں مکر کے ہم جال بچھائیں کیونکر

ان اشعار کو نعرہ بازی اور کھوکھلی جذباتیت کا ترجمان کہنے میں مجھے کوئی باک نہیں۔ کیفی کی نظم "نئی صبح" اُن کی دوسری نظموں سے بہتر ہے اور اِس میں شاعرانہ نظر، شاعرانہ لہجہ اور شاعرانہ آہنگ ملتا ہے ؎

فضا گونجی ہوئی ہے صبح کے تازہ ترانوں سے
سرودِ فتح پر ہیں سرخ فوجیں زخمہ زن جیسے

اِن اشعار میں شاعر کا لہجہ شاعرانہ اور سنبھلا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ صبح کے تازہ ترانوں کی جگہ صبح کے رنگیں ترانے زیادہ بہتر ہوتے کیونکہ "تازہ" کا لفظ ہماری توجہ "صبح کے تازہ اخبار" کی طرف مبذول کراتا ہے۔

اُردو کے جدید تر شعرا کے یہاں بھی جنگ کے اثرات ملتے ہیں۔ قمر ہاشمی کی نظم "یہ رات" جنگ سے ہی متعلق ہے۔ شاعر نے جنگ کے لئے "رات" کا اشارہ استعمال کیا ہے اور اس نظم کا یہ شعر کافی اچھا ہے ؎

یہ رات ارض کی چھاتی پہ سنگ و آہن تھی
حیات کے لئے بپھری ہوئی سی ناگن تھی

..........."سرخ فوجوں کی فتح" قمر ہاشمی کی دوسری نظم

ہے جو سویت روس کے جشنِ فتح کے موقع پر لکھی گئی ...... اِس نظم میں شاعر کمونسٹ شاعروں (سردار اور کیفی وغیرہ) کے اسلوب سے متاثر نہیں ہے بلکہ احمد ندیم قاسمی کی نظم "شفق سُرخ" سے متاثر معلوم ہوتا ہے کیونکہ نظم اشاری ہے لیکن آخری شعر سے موضوع کی وضاحت ہو جاتی ہے اور یہ لطیف اشاریت ابہام سے بالکل مختلف چیز ہے ؎

سحر کی اوٹ سے خاور نے چھیڑی شہنائی
کنول کی گود میں شبنم کی ٹوٹی انگڑائی
گلاب کھل اُٹھے ہر گُل کی پنکھڑی بکھری
لطافتوں کی حیا سے کلی کلی نکھری
نگاہ ہے اُفقِ نو پہ آج عالم کی
کہ پھوٹتی ہے کرن اتحاد باہم کی

اُردو شاعری پر دوسری جنگِ عظیم کا جو اثر پڑا ہے اُس کا ایک جائزہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُردو شاعری دوسری بڑی لڑائی سے واضح طور پر متاثر ہوئی ہے لیکن اِس اثر کے تحت "مونالیزا" اور "شفقِ سُرخ" جیسی نظمیں بہت کم کہی گئی ہیں — اُردو شاعری کا جو حصّہ اِس بڑی جنگ کی عکاسی کرتا ہے وہ زیادہ

مختصر نہ سہی لیکن عظیم بھی نہیں ہے اور بہت کم چیزیں ایسی لکھی گئی ہیں جو فنّی طور پر باقی رہ سکیں گی۔

اُردو ادب
کے
دس سال

اس مطالعہ کا موضوع ہے "اُردو ادب کے دس سال ــــ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۵ء تک ــــ کہنے کو یوں محض دس سال لیکن کتنے تیز رفتار، اور اسی مُدّت کے بارے میں فراق نے کہا ہے ؎

سیّاروں میں کب پہلے یہ گردش وتابش تھی
ہیں موڑ پہ صدیوں کے، دن ایک مہینے کے

اُردو ادب نے زمانہ کی برق رفتاری کا ساتھ دیا ــــ ہر عالمی تحریک سے ہمارا ادب اس دس سال کے عرصہ میں متاثر ہوا۔ ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے انسان دوستی کو اپنا مطمحِ نظر بنایا، اور دُنیا کے جس گوشے میں بھی ظلم وجبر ہوا، اُردو کے فن کاروں نے اس کے خلاف احتجاج کیا ــــ اِن عام تحریکات سے قطعِ نظر دو واقعات

کا زیادہ اثر پڑا ـــــ دوسری جنگِ عظیم اور تقسیمِ ہند ـــــ دوسری جنگ عظیم نے شاعروں کو ،حاشی اور سیاسی شعور عطا کیا، اور تقسیمِ ہند تو ادیبوں کے ذہنی اور فکری توازن کا سب سے بڑا امتحان تھی ـــ ان کے ذہن کے سامنے کتنے ہی سوال تھے ـــ وحشت اور بربریت کا عریاں رقص، بازیافتہ اور اغواشُدہ خواتین، تہذیبی اور ثقافتی اداروں کی تباہی و بربادی، اور سب سے بڑا سوال یہ کہ "کیا ہم دونوں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہو گئے؟ ـــــ کیا ہمارے درمیان اب کوئی مشترک قدر نہیں؟" ـــ مشترک قدروں کا سوال اُردو والوں کے لئے بہت اہم تھا۔ کیوں کہ وہ تو اُردو زبان کو ہندوؤں اور مُسلمانوں کی مشترکہ میراث سمجھتے آئے تھے ـــ ان مسائل نے ادیبوں اور فن کاروں کے ذہن کو اس طرح گھیر لیا تھا کہ حیرت اور کش مکش کے عناصر نے اُن کی تخلیقی قوت اُن سے چھین لی۔ ـــ جو ادیب اِن عناصر پر غالب آئے ان کے یہاں توازن نہ تھا۔ اور فن کی جگہ جذباتی اُبال نے لے لی تھی اس کے لئے انہیں قصوروار ٹھیرانا مجھے ہمیشہ عجیب سا لگتا ہے۔ یہ تو نفسیاتی حقیقت تھی ـــ ممتاز شیریں یہی دیکھتی رہیں کہ کرشن چندر ترازو کے دونوں پلڑے برابر رکھنے کی کوشش کے سوا اور کچھ نہیں کرتے۔

—— میں صرف یہ سوچتا ہوں کہ کرشن چندر لکھتا تو رہا اور مستقبل یہ نہیں کہہ سکے گا کہ وحشیوں کے ہجوم میں کوئی بھی انسان نہ تھا —— آہستہ آہستہ توازن، اعتدال اور فنی ضبط و نظم ہمارے ادب میں پھر سے اپنی جگہ بناتا رہا اور اس دس سال کے ادبی سرمایہ اور تخلیقات سے میں بڑی حد تک مطمئن ہوں —— عسکری صاحب کہتے ہیں کہ اُردو ادب مر گیا۔ میں صرف یہ عرض کروں گا کہ جس دور میں خود عسکری صاحب نے اتنی اچھی تنقیدیں لکھی ہوں، وہ دور ادب کی نئی زندگی کا دور ہے، موت کا نہیں —— اس مختصر تمہید کے بعد دس سال کے اُردو ادب کا ایک سرسری جائزہ پیش کرتا ہوں —— اس جائزہ کو آپ مختصر نوٹ کہیں تو مجھے اعتراض نہ ہوگا۔

تنقید

اُردو تنقید نے گزشتہ دس سال میں نئی وسعتیں حاصل کیں۔ نئے رجحانات پیدا ہوئے۔ ہمارے نقادوں نے مختلف نظریوں کو اپنایا اور انہیں اپنی تنقید میں ڈھالا۔ ادب اور دوسرے عمرانی علوم کے رشتہ پر زور دیا گیا۔ نفسیاتی تنقید کی طرف توجہ کی گئی اور اس میں نئی گہرائی پیدا ہوئی۔ خالص ادبی اقدار کا پرچار بعض نقادوں نے اس انوکھے انداز سے کیا کہ زندگی بھی فن کا

ایک پہلو بن گئی۔ نئی ادبی تحقیقات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اور پُرانے ادب کا جدید انداز سے جائزہ لیا گیا۔

اُردو تنقید کی اس گہرائی اور گیرائی میں پُرانوں کا بھی حصّہ ہے اور نئے نقّادوں کا بھی ــــ مولوی عبدالحق، آثر لکھنوی، حامد حسن قادری، قاضی احمد میاں اختر، ڈاکٹر عندلیب شادانی، نیاز فتح پوری، ڈاکٹر اعجاز حسین اور ڈاکٹر سیّد عبداللہ ...... یہ بزرگ تحقیق و تنقید کے امتزاج کے قائل ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب کی تحقیقات اور نگارشات نے اُردو زبان کی تاریخ میں کئی سو سال کا اضافہ کر دیا۔ آثر لکھنوی فنّی محاسن، زبان کی صحت کے ساتھ ساتھ موضوع اور طریقۂ اظہار پر بھی نظر رکھتے ہیں ــــ اُن کے یہاں تلخ نوائی ضرور آجاتی ہے مگر انصاف کا دامن وہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتے ــــ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے کلیم الدین احمد کی طرح پُرانے بُت توڑے۔ اُن کے فیصلوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور ہمیں بھی اختلاف ہے۔ لیکن جدید تنقید کی تاریخ میں وہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے یہاں تحقیق اور تنقید کا جو توازن ہے وہ شاید کہیں اور نہ ملے ــــ ڈاکٹر عبداللہ اسی وقت لکھتے ہیں جب انہیں کوئی نئی بات کہنی ہو ــــ میر کے مزاج اور شاعری کا انہوں نے بڑا

تفصیلی مطالعہ کیا ہے ــــ تحقیق کے میدان میں ڈاکٹر گیان چند کا نام اس لئے اور زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ وہ انہیں دس سال کی "دریافت" ہیں ــــ اُردو کی داستانوں پر انہوں نے جس طرح دادِ تحقیق دی ہے۔ اس میں اُن کا کوئی ہم سر یا حریف نہیں۔

رشید احمد صدیقی، فراق گورکھ پوری، کلیم الدین احمد اور مجنوں گورکھ پوری نے اس مدت میں کچھ ایسا زیادہ نہیں لکھا۔ لیکن ان کی جو تنقیدیں ہمارے سامنے آئیں اُن میں تخلیق کی شان ہے ــــ اِن چاروں کی تحریروں نے ہمارے ادیبوں کے تفکّر پر گہرا اثر ڈالا ہے ــــ رشید صاحب نے اکبر الہ آبادی اور اُردو غزل پر مفصّل مضمون لکھے ــــ آج ہمارے ادب میں تین نقاد ایسے ہیں جن کی تخلیقی قوت اُن کی تنقیدوں میں جگہ جگہ جھلک اُٹھتی ہے اور وہ نقّاد ہیں رشید احمد صدیقی، فراق اور حسن عسکری۔

ترقی پسند تنقید میں اس عرصہ میں پہلے سے کہیں زیادہ گہرائی پیدا ہوئی۔ حالانکہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور احمد علی کی طویل تنقیدی خاموشی اب بھی محسوس ہوتی ہے۔ عالمی ادب پر ان کی گہری نگاہ سے اُردو تنقید آج بھی بہت کچھ حاصل کرنا چاہتی ہے۔ سیّد احتشام حسین نے ترقی پسند نقطۂ نظر کو اور زیادہ استحکام عطا کیا،

انھوں نے نظریاتی مباحث پر بھی قلم اٹھایا اور نئے پرانے ادب کو بھی پرکھا۔ لیکن ان کے واضح نقطۂ نظر کے باوجود اُن کے یہاں ایک وسیع تنقیدی ہمدردی بھی ہے۔ اور پرانے ادب پر وہ جب بھی قلم اٹھاتے ہیں تو اسی ہمدردی کے ساتھ۔ ممتاز حسین نے ترقی پسند تنقید کو اور آگے بڑھایا۔ احتشام کے بعد وہ اس دبستانِ تنقید کے سب سے ممتاز نقّاد ہیں۔ لیکن ان کے نظریات اور ان کی عملی تنقید میں اب تک خوشگوار مفاہمت پیدا نہ ہو سکی ہے۔ اس کا ایک سبب اُن کا قدرے اُلجھا ہوا اندازِ تحریر بھی ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن اس دبستانِ فکر کے نئے نقّادوں میں بڑی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ان کے خیالات میں بھی وضاحت ہے، اور اسلوبِ نگارش بھی بہت رواں ہے۔

آلِ احمد سرور اُسی توازن اور حد سے بڑھی ہوئی احتیاط کے ساتھ تنقیدیں لکھتے رہے ہیں جو ان کے مزاج کا ایک حصہ بن گئی ہے۔ سرور صاحب ادیبوں اور شاعروں کے ذہن میں سفر کرنے کی قدرت رکھتے ہیں اور اپنے موضوع سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اکثر پڑھنے والے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ترازو کے دونوں پلڑے برابر رکھنے کی کوشش میں دوسری

خوبیوں کو قربان کر دیتے ہیں ـــــ سرور صاحب کو بات کہنے کا جو سلیقہ ہے وہ بہت کم نقادوں کو نصیب ہوا ہے مگر یہ سلیقہ اکثر گہرائی پر اثر انداز ہوتا ہے ـــــ وہ تو بعض شاعروں کی طرح رعنائی پر خیال کو قربان کر دیتے ہیں۔

محمد حسن عسکری کی تنقید نے جھلکیوں کی تنگنائے سے گزر کر نئی وسعتیں حاصل کر لی ہیں ـــ اس عرصہ میں انہوں نے ایک بہت وقیع سلسلہ مضامین لکھا۔ اس سے پہلے ادب پر نظریاتی بحثیں تو بہت ہوئیں لیکن عسکری نے ہمارے لئے اُردو ادب کے نئے مسائل دریافت کئے، اور ان پر خیال افروز مضامین لکھے۔ ترجمہ کا مسئلہ محاورہ اور اُردو نثر کے متعلق ان کے مضامین اُردو تنقید میں ایک نئے دور کا آغاز کرتے ہیں ـــ ادبی اقدار کے از سرِ نو ـــ تعین کی ایک انتہائی کامیاب کوشش ان کا مضمون "فن برائے فن" ہے اس میں تو زندگی فن کی خالق بھی ہے اور فن کا ایک گوشہ بھی ـــ اگر عسکری صاحب کے یہاں "دہشت پسندی" کم ہو جائے اور وہ "اُردو ادب کی موت" کے قسم کے ہنگامہ خیز انکشافات نہ کریں تو وہ بہت "پیارے" نقاد ہو جائیں۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور سید وقار عظیم

نے اُردو تنقید میں نئے رُجحانات کی ترویج کی ہے۔ عبادت بریلوی ادب اور زندگی کے رشتے پر اتنا زور دیتے ہیں کہ اب ان کی تنقیدی دنیا میں خیالات کے ساتھ ساتھ الفاظ کی بے مزا تکرار ملتی ہے۔ لیکن ان کی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے اُردو تنقید میں وضاحت پیدا کی، وہ سیاسی حالات اور اجتماعی ماحول کے ساتھ فن کار کی شخصیت بھی نظر میں رکھتے ہیں۔ ان میں کام کرنے کا جو حوصلہ ہے وہ نئی پود میں مشکل سے کہیں ملے گا۔ اُردو غزل اور اُردو تنقید پر انہوں نے بہت لکھا ہے ——

ابواللیث صدیقی تنقید اور تحقیق کی ہم آہنگی کو ہمیشہ سامنے رکھتے ہیں۔ ترتیب کی اہمیت سے وہ اچھی طرح واقف ہیں —— ان کے یہاں کام کی زبان میں کام کی باتیں ملتی ہیں۔ لیکن یہ زبان بے رنگ نہیں بلکہ اس میں مناسب ادبی آہنگ ہے اور تنقید کے لئے یہی انداز مناسب ہے۔ سیّد وقار عظیم نے تو ویسے تمام ادبی موضوعات پر لکھا ہے لیکن افسانہ ان کا خاص موضوع ہے۔ اُردو افسانہ پر ان کی نظر وسیع ہے۔ تمام نئی تحریکات، تجربے اور تکنیک کے تغیرات کا جائزہ ان کی تنقیدوں میں ملتا ہے۔ لیکن اب وقار صاحب داستانوں اور ڈراموں کی طرف متوجہ ہوئے ہیں —— ان دونوں اصناف

سے متعلق ان کی تنقیدوں میں نہ تو گہرائی ہے اور نہ کوئی نیا اندازِ نظر۔
اس دس سال کی اُردو تنقید کے سلسلہ میں ایک خوش آیند بات یہ ہے کہ ہمارے نقّادوں نے اپنے لئے موضوعات کا انتخاب کر لیا ہے، اس سے فائدہ یہ ہوا کہ مختلف موضوعات پر اب مستقل کتابوں کی کمی نہیں ۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی "اُردو غزل" میں ہماری شاعری کی شہزادیٔ شہزاد کا ہر نقش اُبھر آیا ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث کے مطالعے بھی "غزل اور متغزلین" کے نام سے شائع ہو گئے ہیں ۔ ڈاکٹر عبادت کی کتاب بھی زیرِ طبع ہے ۔ ترقی پسند ادب پر علی سردار جعفری کی کتاب ترقی پسندوں کے نقطۂ نظر کا بہت اچھا اظہار ہے ۔ مختلف موضوعات پر کئی اور اہم کتابیں اس عرصہ میں لکھی گئیں۔ مثلاً ڈاکٹر اعجاز حسین کی کتاب "مذہب اور شاعری"، علی عباس حسینی کی "اُردو ناول کی تاریخ اور تنقید"، ڈاکٹر احسن فاروقی کا تنقیدی جائزہ "اُردو میں تنقید"۔ میر کی زندگی اور شاعری سے متعلق خواجہ احمد فاروقی کی کتاب، اُردو تذکروں کے متعلق ڈاکٹر عبداللہ کا کتابچہ۔ ممتاز شیریں نے سعادت حسن منٹو کے فن کا مفصل تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے اور منٹو کے بارے میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ منٹو کے علاوہ اس کتاب

میں جدید افسانوی ادب کا تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے اور اس ادبی دور کے پسِ منظر میں منٹو کی فنی و ادبی شخصیت اُبھرتی ہے۔
اور آخر میں مجھے خورشید الاسلام اور مجتبیٰ حسین کا ذکر کرنا ہے۔ رشید احمد صدیقی کی تحریروں میں Paradox سے کافی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ خورشید الاسلام نے تنقیدوں میں بھی یہی گُر آزمایا ہے۔ اُن کا اندازِ تحریر ہمارے تمام نقّادوں سے علیحدہ ہے، اور حسن عسکری کے اسلوب کی طرح اس میں بھی بلا کی انفرادیت ہے ــــ خورشید الاسلام نے گنتی کے چند مضمون لکھے ہیں لیکن یہی چند مضامین انہیں اہم نقّادوں کی صف میں جگہ دیتے ہیں ــــ خورشید الاسلام کی تنقید کو مروّجہ مفہوم اور اصطلاح میں تاثراتی کہہ کر ٹال دینا بد دیانتی سے کم نہیں ــــ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے خوبصورت اسلوب میں اُلجھ کر سرسری پڑھنے والے اور ہمارے بیشتر نقّاد معنویت پر غور نہیں کرتے۔ مثلاً اُن کا یہ فقرہ کہ: "شبلی پہلے یونانی ہیں جو ہندوستانی مسلمانوں میں پیدا ہوئے"۔ یا غالب کی شاعری کے بارے میں ان کا یہ جملہ کہ " غالب کے آتے ہی اُردو شاعری کفِ دست پر اپنی ٹھوڑی رکھ کر غرقِ حیرت ہو گئی" ــــ " امراؤ جان ادا" پر

خورشید الاسلام کی تنقید اب تک تو حرفِ آخر ہے۔

مجتبیٰ حسین نے بھی خورشید الاسلام کی طرح زیادہ نہیں لکھا۔ وہ لکھتے لکھتے طویل وقفوں کے لئے ادب سے روٹھ جاتے ہیں۔ فانی کے بارے میں اُن کا مضمون ہمیں اُردو کے اس عظیم غزل گو کے بارے میں نئے انداز سے سوچنے کی دعوت دیتا ہے ـــــ اُن کا ایک مضمون "چہ ذوق نغمہ کم یابی" عرصہ تک ادبی نزاع کا سبب بنا رہا۔ اور یہی کیا کم ہے کہ ذہنی ٹھہراؤ کے اس دور میں لوگ چونکے تو ـــ پھر مجتبیٰ حسین نے چونکانے کی خاطر وہ مضمون نہیں لکھا تھا بلکہ اپنے خیالات کا جرأت سے اظہار کیا تھا ـــ اُن کی بعض رائیں یقیناً ناقابل قبول نہیں لیکن یہی بات ہم دوسرے نقادوں کے بارے میں بھی کہہ سکتے ہیں۔

اس دس سال کے عرصہ میں ہمیں کئی اور اچھے متوازن اور سنجیدہ نقاد نظر آتے ہیں ـــــ خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر عبدالشکور، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ظ انصاری، آفتاب احمد خاں، ڈاکٹر شوکت سبزواری، پروفیسر حنیف فوق اور سلیم احمد کے نام مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔

شاعری

اُردو شاعری میں تغیر و تبدل اور تجربات کا سلسلہ تو ۱۹۳۶ء

سے شروع ہو گیا تھا۔ ــ ایک طرف کچھ شاعر نئے موضوعات کو اپنا رہے تھے اور دوسری طرف کچھ شاعر ہیئت کے سلسلے میں نئے تجربے کر رہے تھے۔ ان شاعروں میں باہمی فرق کتنا ہی ہو مگر یہ سب اُردو شاعری کے نئے امکانات کی سراغ دہی کر رہے تھے ــ ان شاعروں میں جو کَس بَل تھا اس کا اندازہ یوں کیجئے کہ ۱۹۴۵ء تک انہی کی آوازیں ہماری شاعری کے افق پر چھائی ہوئی تھیں۔ اور یہ شاعر تھے جوش، حفیظ، احسان دانش، ساغر نظامی، مجاز، جذبی، جاں نثار، اختر اور مخدوم وغیرہ ـــ (آج حفیظ، احسان دانش اور ساغر نظامی کا تذکرہ ماضی کی بات معلوم ہونے لگا) ـــ یہ شاعر ہماری شاعری کے ایک نئے دور کے نقیب تھے۔ مگر فیض، علی سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، ساحر لدھیانوی، مختار صدیقی، قیوم نظر، سلام مچھلی شہری، یوسف ظفر، اختر الایمان، ابن انشا، ضیا جالندھری ساحر لدھیانوی، تیغ الہ آبادی (حال مصطفےٰ زیدی) جعفر طاہر، عزیز حامد مدنی، کیفی اعظمی، ادا جعفری اور جگن ناتھ آزاد وغیرہ، ان شاعروں کی صف میں شامل ہوئے اور ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ کہ ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۷ء سے اب تک انہیں کا دور ہے۔ اور اُردو کی دس سالہ شاعری میں ان کا حصہ اپنے پیش روؤں سے زیادہ ہے۔

حالانکہ مجازؔ، جذبیؔ اور جاں نثار اخترؔ اب بھی ہمیں مایوس نہیں کرتے اور کبھی کبھی کوئی ایسی چیز ہمارے شعر و ادب کو عطا کرتے ہیں جو ہمیں ان کی زندگی کا از سرِ نو احساس دلاتی ہے۔

کچھ دنوں پہلے جوشؔ صاحب "قبلۂ رندانِ ادب" تھے۔ اور علی سردار جعفری نے اپنے ہم مشرب شاعروں کی امامت جوشؔ صاحب کو عطا کی تھی —— جو اپنے گھن گرج، خلوص اور بے پناہ قوت نظم کی بنا پر اُردو ادب کی تاریخ میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں —— اُن کی زندگی ہی میں یہ فیصلہ یقین کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن آج کی اُردو شاعری کا قبلہ فیضؔ کی ذات ہے۔ ویسے تو ہماری جدید شاعری میں انقلاب کا صحیح تصور سب سے پہلے مخدومؔ نے پیش کیا ع

گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

جوشؔ نے تو انقلابی نعروں کو ہمارے اعصاب پر سوار کر دیا تھا، مگر اُردو کی انقلابی شاعری کی تکمیل فیضؔ نے کر دی —— اُن کے یہاں جس قدر فنی نظم و ضبط ہے اُس کی کوئی دوسری مثال ہمیں جدید ادب میں نہیں ملے گی —— فیضؔ کی انقلابی شاعری میں بھی "دستِ صبا" کی نرمی ہے۔ اسی لئے اُن کی آواز ہمیں صرف آمادۂ پیکار ہی نہیں کرتی بلکہ ہمارے دلوں کو ڈھارس بھی بندھاتی ہے، اور ہمارے

دل کے زخموں پر مرہم بھی رکھتی ہے ـــــ نیّن کی آواز کبھی جذبات کی شدّت سے بےسُری نہیں ہوتی ـــــ وہ تو ایک ظالم حکومت کے ظلم کو بھی جفائے محبوب کے روپ میں دیکھتا ہے۔ شاعرانہ تجربے کی عظمت کی بنیاد ایسی ہی نظر اور ایسا ہی مزاج ہو سکتا ہے ـــــ اُس کے یہاں ذاتی عشق اور وطن سے عشق میں کوئی تضاد نہیں، اور یہی دونوں عشق اُس کا سرمایۂ حیات ہیں ـــــ

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دُشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت
اِس عشق، نہ اُس عشق پہ نادم ہیں مگر دل
ہر داغ ہے اِس دل پہ بجز داغِ ندامت

احمد ندیم قاسمی نے اپنی شخصیت کا اظہار ہر صنفِ ادب میں کیا ہے، اور اُن کے خلوص نے ہر جگہ ان کا ساتھ دیا ـــــ اُن کا فن صہبا کو آبگینے میں ڈھالتا نہیں، بلکہ اُن کی صہبا میں وہ تندی ہے کہ آبگینہ خود پگھل جاتا ہے ـــــ جنگِ عظیم کے ردِّ عمل نے ان سے "ہیروشیما اور ہیروشیما کے بعد" لکھوایا اور تقسیم کے بعد زندگی کی عبرت سامانی اُن کے یہاں افسانے کے قالب میں کم اور شاعری کے پیمانے میں زیادہ نظر آتی ہے ـــــ

علی سردار جعفری نے "نئی دنیا کو سلام" لکھ کر اپنے کتنے ہی رفیقوں کو گردِ سفر کی طرح پیچھے چھوڑ دیا ــــــ "نئی دنیا کو سلام" عہدِ حاضر کی سب سے بہتر تمثیلی نظم ہے۔ کسی دوسرے شاعر نے اتنے بڑے پیمانے پر اِدھر کافی عرصہ سے کوئی ایسی چیز نہیں لکھی ــــــ اس نظم کے مختلف حصوں میں مختلف بحروں کا انتخاب بہت ہی کامیاب ہے ــــ کہیں درانتی کی کاٹ ہے اور کہیں بچے کے ہونٹوں کا تبسم ــــــ مختار صدیقی نے بھی دوسروں سے ہٹ کر اپنے لئے راہ چنی ــــ موسیقی اور شاعری کا تعلق تو ظاہر ہے لیکن مختار صدیقی نے موسیقی کو سازوں کی دنیا سے اغوا کر کے الفاظ میں ڈھال دیا ــــ فیض کے بعد اختر الایمان میرے نزدیک اس عہد کے سب سے اچھے شاعر ہیں۔ (یہ میری ذاتی رائے ہے) ــــ اختر الایمان جیسا تفکر تو کسی کے یہاں نہیں ــــ پھر اختر الایمان کی شاعرانہ لغت Diction دوسروں سے مختلف ہے ــــــ زندگی کے ساتھ ساتھ حُسن سے جو وابستگی اختر الایمان کو ہے اور انسانی عظمت و بے بسی کا بیک وقت جو گہرا احساس اسے ہے شاید ہی کسی اور کو ہو ــــــ اس کی ایک مختصر نظم "سبزہ بیگانہ" میں زندگی، حُسن اور آج کے شاعر کے باہمی تعلقات کچھ اس انداز سے

پیش کئے گئے ہیں کہ ہم اسے اُردو کے نئے شاعروں کا منشور کہہ سکتے ہیں ـــــ مثالوں سے میں قصداً گریز کر رہا ہوں لیکن یہ نظم ـــــ شاید مجھے آگے نہ بڑھنے دے۔

شبِ ماہ تو ہے سحر بھی تو
کہ فغاں بھی تو ہے اثر بھی تو
یہ تری بہار کے دن سہی
یہ ترے نکھار کے دن سہی
نہ مٹا کسی کو سنبھل سنبھل
سرِ راہ یوں نہ بہک کے چل
کہ زمیں پہ رہتے ہیں اور بھی
جنہیں حُسن سے بھی لگاؤ ہے
جنہیں زندگی بھی عزیز ہے

ساحر لدھیانوی کو جدید تر شعراء میں شاید سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ مقبولیت انہیں اپنی رومانی نظموں اور تاج محل کی وجہ سے نصیب ہوئی۔ کیونکہ ان نظموں میں عنفوانِ شباب کے کچّے، خام کارانہ بے حد گرم و شدید عشق کا اظہار ہے ـــ ساحر نے اس عہدِ شباب کی شاعری سے گزر کر

زندگی کی آگے بڑھتی ہوئی طاقتوں سے اپنا ناتہ جوڑ لیا، اور ان کی انقلابی شاعری کو بھی مقبولیت حاصل ہوئی۔

ابنِ انشا ان سب کی نسبت نیا ہے۔ لیکن اُس نے اردو میں طویل نظم کی روایت کو بہت آگے بڑھا دیا۔ وہ شاعری میں اپنا ایک مزاج رکھتا ہے، اور وہ ہے "الف لیلائی مزاج" لیکن وہ "بزمِ ہارون" میں بھی سوتا نہیں بلکہ اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہے اور انسانی دُکھ درد کا احساس یہاں بھی اس کے نغموں کا پیچھا نہیں چھوڑتا ـــــ ابنِ انشا کی عشقیہ نظموں میں "چاند" ایک کردار کی حیثیت رکھتا ہے جو بھیس بدل بدل کر بار بار نظر آتا ہے ـــــ ابنِ انشا اس دنیا کا نہیں بلکہ چاند نگر کا باسی ہے۔

ضیا جالندھری، عزیز حامد مدنی، تیغ الٰہ آبادی اور جعفر طاہر اس دس سالہ شاعری کی تاریخ میں کتنے ہی شاعروں کے ہجوم میں دوسروں سے بہت الگ اور بلند قد نظر آتے ہیں ـــــ ان سب کے یہاں ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے حیات و کائنات کی وسعتوں کا احساس ـــــ عزیز حامد مدنی اور تیغ الٰہ آبادی نے اپنی طویل نظموں میں تو انسان کی ذہنی اور فکری زندگی کے کتنے ہی ابواب کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ جعفر طاہر نے بھی طویل نظم کو اپنایا ہے

اور جہاں تک الفاظ کے انتخاب کا تعلق ہے وہ اپنے تمام ہمعصروں سے علیحدہ ایک رنگ رکھتے ہیں ـــــ Diction میں انہوں نے کئی تجربے کئے لیکن یہ تجربے صرف تجربے ہی نہیں بلکہ بڑی شاعری بھی ہیں ـــــ ہمارے شاعر جو الفاظ استعمال کر رہے تھے ان کا Range بہت محدود تھا۔ جعفر طاہر فارسی اور ہندی کے نئے الفاظ سے ہماری شاعرانہ لغت کو مالا مال کر رہے ہیں، اور ان الفاظ کے استعمال کا سلیقہ بھی انہیں حاصل ہے ـــــ پھر یہ الفاظ ان کے موضوعات کے عین مطابق ہوتے ہیں ـــــ

جن شعراء کے نام میں پہلے پیش کر چکا ہوں، ان کے علاوہ کئی اور ذہین شاعر اپنے افکار اور فن سے نئی اُردو شاعری میں اچھے اضافے کر رہے ہیں، لیکن ابھی ان کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہو گا ـــــ ان کو ابھی عظمت اور بلندی سے ہم کنار ہونے کے لئے کتنے ہی مرحلوں سے گزرنا ہے۔ قتیل شفائی، ظہور نظر، احمد راہی، عارف عبدالمتین، حمایت علی شاعر، نریش کمار شاد، احمد فراز، سلیمان اریب، شاذ تمکنت وغیرہ ایسے ہی شعراء میں سے چند ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ہماری نظم نگاری میں بعض عناصر کا احیاء ہوا اور بعض نئے عناصر پیدا ہوئے ـــــ اقبال کے بعد

قومی و ملی شاعری آثر صہبائی، امین حزیں اور اسد ملتانی وغیرہ کے دم قدم سے بالکل رسمی سی چیز ہو کر رہ گئی تھی ــــ قیامِ پاکستان نے ہمارے شاعروں کو بے حد متاثر کیا، اور قومی شاعری میں نئی راہیں پیدا ہوئیں، اور نئے انداز کی نظمیں کہی جانے لگیں ــــ ان نظموں میں جو تہذیبی شعور ہے اس سے پہلے اقبال کے سوا اور کہیں نہ تھا ــــ حمید نسیم نے پہلا قومی غنائیہ ــــــــ "ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا" لکھا ــــ اس میں نظمِ معرّا اور نظمِ پابند کا امتزاج بہت خوب صورت ہے۔ اور حمید نسیم نے ملتِ اسلامیہ برِصغیر کی جدوجہد آزادی کو خوبصورت شاعرانہ اشاروں میں مقید کر دیا ــــ شان الحق حقی نے اس سے زیادہ وسعت کے ساتھ ایک غنائیہ لکھا "کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد" ــــ اس غنائیہ میں شعر و موسیقی کا بہت ہی رچا ہوا آہنگ موجود ہے، اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے بہتر قومی غنائیہ اب تک نہیں لکھا گیا ــــ حقی نے اجتماعی جذبات کو تغزل عطا کیا ہے۔ اسی لئے اس غنائیہ میں رپورٹنگ نہیں بلکہ جذبہ ہے۔ ــــ ش، ضٰی نے بھی اچھی قومی نظمیں لکھی ہیں، خاص طور پر ان کا "ساقی نامہ"

اُردو نظم کے سلسلہ میں سید محمد جعفری کا تذکرہ میں نے دانستہ نہیں کیا ہے کیونکہ اُردو طنز و مزاح پر لکھتے ہوئے میں نے نثر و نظم کی تخصیص نہیں کی۔

ان نوجوان شاعروں کے علاوہ مانے ہوئے نظم گو شعراء بھی دس سال کے اس عرصہ میں اپنے افکار پیش کرتے رہے ہیں مثلاً جوش ملیح آبادی، علی اختر حیدرآبادی، روش صدیقی اور پروفیسر شور وغیرہ ــــ شاد عارفی نہ جانے اب غزل کی طرف کیوں ملتفت ہو گئے ہیں۔ ورنہ ان کے طرز کی نظمیں اس دور میں اور کس نے لکھی ہیں؟ ــــ ویسے تو ان کی غزل میں بھی نظمیت اور ان کا مخصوص طنزیہ انداز موجود ہے۔ غزل گو شعراء میں سے فراق گورکھپوری اور آثر لکھنوی نے بہت سی اچھی نظمیں لکھیں۔ خاص طور پر فراق کی نظم "آدھی رات" اور آثر کا ترجمہ ــــ "دانتے کا جہنم" تاثیر مرحوم کی نظم "یدِ بیضا" فن کی بلندیوں اور فن کار کے تخیلات کی آئینہ دار ہے۔ اس موضوع پر پچھلے دس سال میں اور کوئی ایسی اچھی نظم نہیں کہی گئی۔

۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء تک تو اُردو نظم کا دور رہا، لیکن ۱۹۴۷ء سے غزل کی تجدید اور احیاء ہوا ــــ غزل نے ہمیشہ سماجی اور خارجی

محرکات سے اپنے کو ہم آہنگ کر کے ہر ادبی بحران پر قابو پالیا، اور اس کا سبب غزل کی بہت ہی معنوی اشاریت ہے — ۱۸۵۷ء سے لے کر اب تک غزل نظم پر حاوی رہی ہے اور غزل کو وسیلۂ اظہار بنا کر ہمارے شاعروں نے اسے نئے تقاضوں کا متحمل بنایا — غزل کی اس مقبولیت کا سبب موجودہ حالات میں تلاش کیا جا سکتا ہے — ۱۹۴۷ء کے فسادات، انسان کی انسان دشمنی دونوں حکومتوں کے غیر جمہوری رجحانات اور زبان و قلم پر پابندی — ان حالات میں تفصیل سے کام نہیں لیا جا سکتا بلکہ بات اشاروں ہی میں کہی جا سکتی ہے اور غزل تو انسانی روح کا اشارہ اور سرگوشی ہے۔

اُستادوں اور پُرانے غزل گو شاعروں نے بھی نئے حالات کو سمجھا اور غزل کے نئے رجحانات کی تخلیق میں وہی پیش رو رہے ہیں — خاص طور پر فراق گورکھپوری، آثر لکھنوی اور جگر مرادآبادی — جگر کا تو اندازِ سخن ہی بدل گیا ؎

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزلخواں ہے آج کل

اور غمِ دوراں یوں کبھی غزل کے آئینہ میں نہ چمکا تھا ؎

حوادثِ غمِ دوراں نے پھر کہا "تسلیم"
لطافتِ غمِ جاناں کا ذکر آیا تھا

—— ثاقب کانپوری

آج کی اُردو غزل میں چھالوں کی سی کیفیت ہے —— چھالے جو دُکھتے ہیں مگر پھوٹ بہنے کے قائل نہیں —— فسادات کا اثر مشرقی اور مغربی پنجاب کے اُردو شاعروں کے یہاں زیادہ نمایاں ہے۔ خاص طور پر احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی اور جگن ناتھ آزاد کے یہاں —— لیکن غزل کا موضوع آج صرف یہ نہیں، غزل نے کتنے ہی موضوعات تسخیر کر کے اپنی مملکت میں شامل کر لئے ہیں —— فیض آج کے غزل گو شعراء کے کارواں میں بھی اپنے ہم سفروں سے بہت آگے ہیں۔ فیض اور حفیظ ہوشیارپوری کی غزلوں کو آج کی اُردو غزل کا بہترین ترجمان کہا جا سکتا ہے ——

فیض نے غزل کی روایت میں قابلِ قدر اضافے کئے ہیں۔ ہماری شاعری میں عشق و بغاوت کی معراج اب تک دار و رسن تھی لیکن فیض نے اس روایت کو بدل دیا —— کیونکہ رسن و دار سے آج کا عشق بلند تر ہے ؎

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے • تو لوٹ آئے ترے سربلند کیا کرتے

فیض کے اشعار آج ہر ذہن میں گونج رہے ہیں اسی لئے زیادہ مثالوں کی ضرورت نہیں ۔۔۔ حفیظ کی غزلوں میں ہماری بہترین عشقیہ اور تمدنی روایات بھی ہیں اور وسیع انسان دوستی بھی ۔۔۔ انسان دوستی کا ایسا اظہار غزل کی حدود میں اور کسی جدید غزل گو سے نہ ہو سکا ہے

تعبیر کیا تو نے اسے عشق سے ورنہ
کس کے لئے اے دوست پشیماں ہوئے ہم
محدود ہے غم ایک نہ اک آفتِ جاں تک
افسوس حریفِ غمِ انساں نہ ہوئے ہم!

دس سال کی اس مدت میں غزل کے سلسلہ میں متذکرہ بالا شاعروں کے علاوہ سیف، عدم، احمد ندیم قاسمی، ابنِ انشاء، شان الحق حقی، ناصر کاظمی، باقی صدیقی اور سلیم احمد کے نام زیادہ نمایاں اور ممتاز ہیں ۔۔۔ اردو غزل اس باب میں خوش قسمت ہے کہ ان شعراء کے علاوہ اور بہت سے نوجوان آرائش خم گیسوئے غزل میں مصروف ہیں ۔۔۔ ان تمام شعراء کے فن کا جائزہ اس مختصر تبصرہ میں ممکن نہیں ۔۔۔ آخر میں میں نئے شاعروں کے دو شعر پیش کرتا ہوں اور سنئیے کہ ان شاعروں کے

نام بھی مجھے معلوم نہیں) —— ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اردو غزل ستارہ شکنی اور آفتاب سازی میں مصروف ہے اور اس کی کامیابی یقینی ہے —— پہلا شعر تو اردو اور فارسی کے "زندانی ادب" میں یقیناً ایک اضافہ ہے —— اور میں بغیر کسی جھجک کے کہتا ہوں کہ زنداں کے بارے میں ایسا شعر تو فیضؔ کے "دستِ صبا" میں بھی نہیں —— اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ فیضؔ جیل میں آرام سے رہے ہوں اور تنہا کوٹھری کی تنہائیوں کے تجربہ سے نہ گزرے ہوں —— کتنے عظیم تجربہ کا اظہار ہے یہ شعر ؎

کچھ عجب بوئے نفس آتی ہے دیواروں سے
ہائے زنداں میں بھی کیا لوگ تھے ہم سے پہلے

دوسرا شعر یہ ہے ؎

ہوس کو ملتا ہے ہر شب ہی یاسمن سا بدن
نصیبِ عشق وہی یادِ بوئے پیراہن

افسانہ

۱۹۴۵ء میں جو ہمارے اس مطالعہ کا نقطۂ آغاز ہے۔ اردو افسانہ اپنی انتہائی بلندیوں پر ملتا ہے —— ایک طرف

تو پریم چند اسکول کے مقلد علی عباس حسینی، ڈاکٹر اعظم کریوی اور سدرشن ہماری عوامی اور دیہاتی زندگی کو پیش کر رہے تھے ـــ اور دوسری طرف حیات اللہ انصاری، احمد علی، فیاض محمود، پروفیسر اختر انصاری ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر رشید جہاں نے نئی روایات قائم کیں ـــ ۱۹۳۹ء سے ہمارے افسانے کو جس گروہ سے سابقہ پڑا، اس نے زندگی کے ہر پہلو کو افسانوں کے ذریعہ پیش کیا ـــ اس گروہ کے راہبر اور نقیب کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی اور سعادت حسن منٹو ہیں، اور یہ چاروں میرے نزدیک اردو افسانے کے بہترین ترجمان ہیں ـــ ان کے ساتھ ساتھ اس دور میں صفِ اوّل کے کئی اور افسانہ نگار ملتے ہیں۔ ان سب کے فن میں ایک انفرادیت ہے، یہ سب نئے موضوعات اور نئے تجربات اپنے دامن میں لے کر آئے ـــ اوپندر ناتھ اشک، غلام عباس دیوندر ستیارتھی، اختر اورینوی، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، ممتاز مفتی ابراہیم جلیس، محمد حسن عسکری، قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں، ہاجرہ مسرور، ان کی بہن خدیجہ مستور، شکیلہ اختر، شفیق الرحمٰن اور مہندر ناتھ زیادہ ممتاز حیثیت رکھتے ہیں ـــ اس دور میں موضوعات کی وسعت کے ساتھ ساتھ تکنیک کے نت نئے تجربے ملتے ہیں۔

ہمارے اس دور کے افسانوں میں آفاقی محبت بھی ہے اور جنسی رومان بھی۔ سیاسی شعور بھی اور نہاں خانۂ دل کے تجزیے بھی۔

کرشن چندر کی افسانہ نگاری میں جو تنوع ہے، انہوں نے جو تجربات کیے، ان کا فن جن ارتقائی منزلوں سے گزرا، اس سلسلے میں ان کا کوئی حریف اور مقابل نہیں ـــ کرشن چندر نے کشمیر کی خالص رومانی کہانیاں لکھیں، پھر ان کہانیوں میں تلخیاں بھی اُبھر آئیں۔ فسادات پر ان کا افسانوی احتجاج تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ قحط بنگال کو انہوں نے اَن داتا لکھ کر ہمیشہ کے لئے ادبی تاریخ کا حصہ بنا دیا۔ اُردو میں بغیر پلاٹ کی کہانی لکھی۔ پہلا رپورتاژ لکھا۔

عصمت چغتائی کرشن چندر سے زیادہ چابکدست فن کار ہیں۔ مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی ذہنی اور گھریلو زندگی کی عکاسی اُن سے بہتر کسی نے نہیں کی۔ ناگفتنی باتوں کے کہنے کا جو سلیقہ انہیں ہو وہ منٹو کے یہاں بھی نہیں ملتا ـــ اردو کے افسانہ نگاروں میں زبان پہ جیسی قدرت عصمت کو ہے کسی اور کو نہیں۔

راجندر سنگھ بیدی فنی حیثیت سے اُردو کے سب سے اچھے افسانہ نگار ہیں ـــ رومانیت اور سنگین حقیقت نگاری کو انہوں نے نئے انداز سے افسانہ میں یکجا کر دیا ـــ ان کی

حقیقت نگاری بڑی بے رحم ہے۔

سعادت حسن منٹو اُردو کا سب سے "بدنام" افسانہ نگار ہے۔ ہمارے دوسرے افسانہ نگار اپنی مجموعی کاوش کی بنا پر زندہ رہیں گے لیکن منٹو نے جتنے غیر فانی افسانے لکھے شاید کسی نے نہ لکھے۔ "نیا قانون"، "ہتک" اور "بابو گوپی ناتھ" اردو کے افسانوی ادب کا نقطہ عروج ہیں۔

دوسروں نے جماعت کا حق ادا کیا اور ممتاز مفتی اور محمد حسن عسکری نے "فرد" کو اہمیت دی — آخر فرد بھی تو ایک جماعت اور تمدن کا حصہ ہوتا ہے — ممتاز مفتی نے انسان کے شعور اور لاشعور کی گرہیں کھولیں۔ کہیں کہیں وہ خود ہی اُلجھ گئے — حسن عسکری کے بارے میں اختصار کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کرشن چندر جدید ہے تو عسکری جدید تر — عسکری کے افسانے اس کے تمدنی مشاہدہ اور مشرق و مغرب کے بہترین ادب کے مطالعہ کا امتزاج پیش کرتے ہیں — "ذکرِ انور" اور "قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے" جیسے افسانوں کا خالق ہمیشگی کی زندگی حاصل کر چکا ہے ہمارے ادب میں۔

تقسیم ہند کے بعد ہمارا افسانہ رُو بہ انحطاط نظر آتا ہے —

اس انقلاب نے ہمارے افسانوی ادب سے گہرائی اور توازن چھین

لیا ــــ کتنے ہی افسانہ نگار اپنی تخلیقی قوت کھو بیٹھے، اور ان میں عسکری، فیاض محمود، اختر حسین رائے پوری اور احمد علی جیسے لکھنے والے بھی موجود ہیں۔ کرشن چندر نے جو کچھ فسادات کے موضوع پر لکھا اس میں فن کم ہے اور جذبات زیادہ ــــ لیکن اس دور میں کرشن چندر کے یہاں انسانی محبت، بچوں کی معصومیت اور سیاسی شعور اُبھر آیا ہے۔

تقسیم کے بعد پرانے افسانہ نگاروں میں سے اگر کسی نے نئی بلندیاں حاصل کیں تو وہ سعادت حسن منٹو ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اس کے افسانوں میں "جنس" مقصد نہیں بلکہ اس نے جنسی مسائل کو زندگی اور حیات و کائنات کے پس منظر میں دیکھنا شروع کیا۔

منٹو کے علاوہ غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، ممتاز مفتی اور بلونت سنگھ نے بھی نہ صرف اپنے معیار کو باقی رکھا بلکہ بہت اچھی اور مکمل کہانیاں لکھیں ــــ غلام عباس کا "اوور کوٹ" اور قاسمی کا "رئیس خانہ" اور "نمونہ" اس کی اچھی مثالیں ہیں۔

ابوالفضل صدیقی اُردو افسانہ میں ایک اندازِ خاص کے مالک ہیں ــــ وہ بڑے پیمانے پر کہانیاں لکھتے ہیں ــــ زبان و بیان پر عبور رکھتے ہیں، اور ناگفتنی باتوں کو گفتنی بنانے کا گُر انہیں خوب آتا ہے ــــ تفصیلات پر اُن کی گرفت ہمیشہ بڑی مضبوط

رہتی ہے ـــ یو۔پی کے جاگیردارانہ نظام اور اس کے انحطاط کے وہ سب سے بڑے افسانوی مبصر ہیں۔ ستاروں کی چال، میراث اور گلابِ خاص ـــ یہ افسانے اُن کے فن کی نمایندگی کرتے ہیں۔

بلونت سنگھ نے تقسیم کے بعد ناولٹ اور طویل مختصر افسانہ کو اپنایا لیکن انہوں نے بہت اچھے افسانے بھی لکھے ـــ اُن کے دوسرے افسانوی مجموعہ "پہلا پتھر" میں کئی ایسے افسانے ہیں جو جدید افسانوی ادب میں بلند مقام رکھتے ہیں۔

تقسیم کے بعد انحطاط نظر آتا ہے لیکن جمود نہیں ـــ پُرانے افسانہ نگار حالات سے مطابقت پیدا نہ کر سکے لیکن ان کی جگہ نئے لکھنے والوں نے لے لی ـــ ان میں سے بعض کی افسانہ نگاری تقسیم سے پہلے شروع ہوئی تھی ـــ ان لکھنے والوں نے اس مختصر عرصہ میں اپنی فنّی انفرادیت کو اُجاگر کیا۔ طریقۂ اظہار کے نئے تجربے کئے ـــ اور ابھی اُن میں سے کئی تھکے نہیں بلکہ آگے بڑھ رہے ہیں ـــ ان افسانہ نگاروں میں قدرت اللہ شہاب، انور، اشفاق احمد، اے۔حمید، شوکت صدیقی، آغا بابر، جاوید جعفری، تسنیم سلیم چھتاری، انتظار حسین، ریاض روفی، رضیہ سجاد ظہیر، جیلانی بانو، دیوندر اِسّر، خلیل احمد اور انور عظیم وغیرہ ایسے

افسانہ نگار ہیں جن کا مطالعہ اُردو افسانے کے نئے رجحانات کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔

قدرت اللہ شہاب نے کئی اچھے افسانے لکھے، اور ان کا طویل افسانہ "یا خدا" فسادات پر بہت اچھے افسانوں میں سے ایک ہے — انور کا طنز زندگی کے عرفان سے پیدا ہوا ہے۔ — اشفاق احمد نئے افسانہ نگاروں میں تو مجھے سب سے بلند نظر آتے ہیں۔ "شب خون"، "اُمّی" اور "بابا لوگ" یہ افسانے نہیں بلکہ نئے عناصر ہیں — "گڈریا" میں جو فنّی نظم وضبط اور تمدّنی پس منظر ہے وہ اتنی تفصیل کے ساتھ فسادات کے موضوع پر کسی اور افسانے میں نظر نہیں آتا۔

اشفاق احمد نے اپنے افسانوی مجموعہ کو "ایک محبت سو افسانے" کا نام دیا ہے — یہ نام ان کے فن کی سب سے بڑی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے — محبت کے ان کے افسانوں میں کتنے ہی پہلو ہیں اور ہر پہلو رخسارِ محبوب کے اُن بدلتے ہوتے رنگوں کی طرح ہے جو ہم سے کتنے ہی ان کہے افسانے کہہ جاتے ہیں — اشفاق کے یہاں محبت محض رومان اور جنسی جذبہ تک محدود نہیں بلکہ ان میں بچپن کی حیرت اور معصومیت، نوعمری کا تجسس

اور بلوغ کی توانائی ——— یہ سب باتیں یک جا ہو گئی ہیں ———
محبت ان کے افسانوں میں کوئی روگ یا بیماری نہیں بلکہ ایک
قوت ہے، اسی لئے ان کے افسانوں کی رومانی اور خواب آلود
فضا ہمیں بیمار نہیں معلوم ہوتی ——— ان کے کردار ذہنی طور پر
اکثر "ماضی" میں رہتے ہیں لیکن وہ اپنے اس ماضی کو کوئی بوجھ
یا وبالِ دوش نہیں سمجھتے کیونکہ جن گھڑیوں سے محبت وابستہ ہو
وہ گھڑیاں سعادتوں کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتیں ———

اشفاق کے فن میں دستِ صبا کی سی نرمی ہے اور اس کے
افسانوں کے ہاتھ ہمارے دل کے زخموں پر مرہم رکھتے ہیں ———
یہ وہی چیز ہے جسے **Healing Power** کہا گیا ہے ———
ان کے فن میں ضبط و نظم ہے ——— ان کے کردار کہانی کی فضا
میں اپنی پوری شخصیت حاصل کر لیتے ہیں اسی لئے ہم پر گہرا
اثر چھوڑتے ہیں۔

اے۔ حمید اردو افسانہ میں نئی رومانیت لے کر آیا ——— یہ
نئی رومانیت حجاب امتیاز علی اور اُن کے دور کے دوسرے
لکھنے والوں کی رومانیت سے مختلف چیز ہے ——— اس کے
رومان پر دوسری جنگِ عظیم کے بھیانک اور مہیب عکس اور

سائے نظر آتے ہیں ـــــ جدید تر افسانہ نگاروں میں اُس جیسی خوبصورت شاعرانہ نثر شاید ہی کوئی لکھتا ہو ـــــ یہ خوبصورتی لہجے اور رومانی الفاظ کی مرہونِ منت نہیں بلکہ اِن کا سرچشمہ رومانی افتادِ طبع اور فطرت سے والہانہ لگاؤ ہے ـــــ فطرت کا یہ لگاؤ اُس کی نثر میں پھولوں اور تیتری کے پروں کے رنگ بکھیر دیتا ہے ـــــ اِس نثر نے اُن کے افسانوں میں ایک شیریں تاثر پیدا کر دیا ہے لیکن کہیں کہیں کرشن چندر کی طرح اے۔حمید بھی اپنے اسلوب کے قیدی نظر آتے ہیں ـــــ یہ اسلوب پاؤں کی زنجیر بن جاتا ہے۔ اور فن کے تقاضوں کو وہ بھول جاتے ہیں۔

شوکت صدیقی مخصوص کرداروں اور ماحول کی تخلیق بڑی محنت سے کرتے ہیں ـــــ اُن کے فن میں جزئیات اور تفصیلات کی بڑی اہمیت ہے، اِن کی مدد سے وہ واضح، حقیقی اور ٹھوس فضا اور ماحول پیدا کرتے ہیں ـــــ دوسرے افسانہ نگاروں میں ہمیں ماحول کی تصویریں ملتی ہیں، شوکت کے یہاں جیسے حقیقی ماحول ملتا ہے ـــــ یہ بات اُن کی فنی انفرادیت کی سُراغ دِہی کرتی ہے ـــــ شوکت کے فن کا منتہا محض ماحول کی تخلیق نہیں بلکہ وہ ماحول کی تخلیق اس لئے کرتے ہیں کہ

ان کے کردار مخصوص ماحول میں رہ سکیں ــــ یہ کردار آج کی زندگی کے انتشار، بے چینی اور ہمہ گیر الجھنوں کے ترجمان ہیں۔ شوکت کے افسانوں میں ہر جگہ مقصدیت ملتی ہے لیکن فن اور ادب کے پردوں میں ــــ شوکت کے یہاں ہمیں جو کمی محسوس ہوتی ہے وہ تنوع کی کمی ہے ــــ ایک خاص ماحول اور خاص قسم کے کردار اُن کے فن پر چھا گئے ہیں ــــ جین آسٹن کی طرح شوکت کی دنیا محدود ضرور ہے مگر وہ اپنی دنیا کے ہر گوشے سے واقف ہیں۔

انتظار حسین کی افسانہ نگاری کا محور اُن گلی کوچوں کی یاد ہے جو سرحد کے اُس پار رہ گئے۔ یہ تہذیبی اور تمدّنی شعور حسن عسکری کے بعد ہمیں انتظار حسین کے یہاں ملتا ہے۔ ان دونوں کی افسانہ نگاری میں صرف یہ "تہذیبی شعور" ہی مشترک ہے ورنہ اِن کا فن یکسر مختلف اور جداگانہ ہے ــــ اُن کے اسلوب اور موضوع ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں ــــ اِن دونوں کو ہم علیحدہ کر ہی نہیں سکتے۔ کسی دوسرے افسانہ نگار کے یہاں اسلوب کی وہ اہمیت نہیں جو انتظار کے یہاں ہے بلکہ سچ پوچھئے تو یہ اسلوب اُن کے فن کا بنیادی حصہ ہے ــــ ماحول، کرداروں اور اسلوب کی

یہ ہم آہنگی اور اتحاد انتظار حسین کی سب سے بڑی ادبی فتح ہے۔ ــــ لیکن انتظار حسین کو ایک فن کار کی حیثیت سے یہ سوچنا ہے کہ یہ گلی کوچے کب تک اُن کے فن کی منتہا رہیں گے اور وہ اس ہر دم جواں، رواں اور دواں زندگی سے آنکھیں بند کئے ہوئے حافظہ کے پردہ پر فانوسِ خیالی کے عکس کب تک دیکھتے رہیں گے؟

اس مختصر جائزے میں کئی اہم نئے افسانہ نگاروں کے فن کے بارے میں اشارے بھی نہیں کئے جا سکے مثلاً آغا بابر، انور عظیم جیلانی بانو، دیوندر اِسّر وغیرہ ــــ بہرحال مجموعی طور پر مجھے یہ کہنا ہے کہ آج کا اُردو افسانہ نگار زندگی کے نئے سفر کا راہرو ہے ــــ دیکھئے کہ وہ اس قافلۂ حیات کا رہبر کب بن سکے گا؟

"رپورتاژ" اور "شخصی خاکوں" کا تذکرہ افسانہ کے ساتھ شاید غیر مناسب نہ ہو۔ کرشن چندر کے "پودے" کو اُردو کا پہلا رپورتاژ قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس میں وہ حقیقت نگاری نہیں جو رپورتاژ کا خاصّہ ہوتی ہے ــــ اس میں افسانوی رنگ اُبھر آیا ہے۔ شاہد احمد دہلوی کا رپورتاژ ادبی حقیقت نگاری کے معیار پر پورا اترتا ہے ــــ "دلی کی بپتا" کا سا تاثر بہت کم نئی

تحریروں میں نظر آئے گا۔ یہاں فن کار نے ذاتی تجربات کو ادبی آنچ سے آفاقی بنا دیا ہے۔ محمود ہاشمی کے رپورتاژ "کشمیر اداس ہے"۔ میں ہر نقش واضح ہے۔ موضوع کے ساتھ انہوں نے خلوص برتا ہے لیکن افسانوی لہریں یہاں بھی ہیں ۔۔۔ اردو رپورتاژوں کے سلسلہ میں انتظار حسین کے "سانجھ بھئی پردیس" کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

شخصی خاکوں کو دس سال کے اس عرصے میں کافی فروغ حاصل ہوا۔۔۔ مشہور ادیبوں نے اپنے ہم عصروں کے خاکے لکھے۔ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے کتابچے اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں ۔۔۔ منٹو نے تو شخصی خاکوں کا مجموعہ پیش کیا ۔۔۔ "گنجے فرشتے" ۔۔۔ اس بزم میں جتنے بھی فرشتے شریک ہوئے ہیں ان سب کا مونڈن منٹو نے بڑے سلیقہ سے کیا ہے۔ لیکن ان خاکوں میں ہمیں عصمت کے "دوزخی" کے معیار کا کوئی خاکہ نہیں ملتا ۔۔۔ احمد بشیر اور نصر اللہ خاں نے بھی کئی اچھے خاکے لکھے، اور خاص طور پر نصر اللہ خاں نے شاہد احمد دہلوی کی جو تصویر پیش کی ہے وہ نوک پلک سے پوری طرح درست ہے ۔۔۔ محمد حسن عسکری نے ہم عصر ادیبوں کے بارے میں جو مضامین لکھے ہیں ان

ہیں خاکوں کی جھلک تو ہے لیکن وہ مکمل خاکے نہیں ہیں۔ انہیں ادبی و شخصی تاثرات کہنا بہتر ہوگا۔

ناول

ناول اور ڈرامہ، یہ دونوں اصناف میرے نزدیک اُردو ادب کے ویران گوشے ہیں ـــ نذیر احمد، سرشار اور ہادی رسوا نے جس روایت کو ہمارے ادب میں قائم کیا وہ زیادہ مستحکم نہ ہو سکی، اور نہ اُس کی جڑیں ہمارے ادبی مزاج میں پیوست ہو سکیں ـــ پریم چند نے یقیناً زندگی کے کئی پہلوؤں سے ہماری ناول کو آشنا کیا اور پھر اُن کے بعد محفل پر سناٹا تھا۔

گزشتہ دس پندرہ سال کے ناولوں پر نظر ڈالتے ہوئے مجموعی طور پر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے فن کاروں نے اُردو ادب کی اس کم مائگی کا احساس کیا اور وہ ناول نگاری کی طرف متوجہ ہوئے ـــ سجاد ظہیر کا ناولٹ "لندن کی ایک رات" اس سلسلہ کی پہلی کرن کی حیثیت رکھتا ہے ـــ اس کے بعد کرشن چندر، عزیز احمد اور عصمت چغتائی نے اُردو ناول کے ارتقا میں حصہ لیا ـــ کرشن، عزیز اور عصمت کے فن کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اس ضمن میں مجھے کوئی نیا فیصلہ نہیں دینا ہے اور نہ تفصیلی

تنقید کرنی ہے۔ کرشن چندر کی "شکست" کشمیر کا پہلا دستاویزی اور مفصل مطالعہ ہے۔ ویسے تو کشمیر کرشن چندر کے افکار کی سرزمین ہے اور وہ بہت سے افسانے کشمیر کے متعلق لکھ چکے تھے لیکن شکست میں کرشن چندر نے اپنے مطالعہ میں تفصیلات کی مدد سے مینا کاری کرنی چاہی ہے۔ کرشن کے فن میں بہت سی خوبیاں ہیں مگر ان کی جذباتیت اُن کے یہاں بھیدی کا سا نظم و ضبط پیدا نہیں ہونے دیتی۔ اسی لئے شکست میں ایک بہت اچھے ناول کی تنظیم نہیں —— ہاں اس کے بعض ٹکڑے اور مناظر اُردو نثر میں بڑی اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ "جب کھیت جاگے" میرے نزدیک نہ تو ناول ہے اور نہ ناولٹ —— اب کرشن چندر نئے حوصلہ کے ساتھ ناول کی طرف متوجہ ہوئے ہیں —— "طوفان کی کلیاں" پانچ ناولوں کے سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اس ناول میں کرشن چندر کشمیر کی رُوح سے اور زیادہ قریب آگئے ہیں۔ اور یہ ادب کی وہ منزل ہے جہاں ناول کی تکنیک، شاعرانہ نثر، انسان دوستی اور سیاسی شعور ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔

عصمت چغتائی کی ناولٹ "ضدی" کو ترکی زبان کی کہانی "ہاجرہ" کا ترجمہ کہا گیا ہے لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

یہاں اہمیت پلاٹ کی نہیں بلکہ اندازِ بیان کی ہے ــــ سماجی اونچ نیچ اور تفاوت کے پرانے موضوع کو عصمت نے بڑے جاندار کردار عطا کیے ہیں ــــ چھوٹے ٹھاکر اور آشا دونوں آنے والی دنیا کے پیغامبر ہیں ــــ ضدی مختصر کینوس کی ایک تصویر ہے لیکن عصمت نے ٹیڑھی لکیر بڑے پیمانے پہ لکھی ہے ــــ عصمت بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں کیونکہ اپنے موضوعات کی نزاکت کے پیشِ نظر وہ اشاروں سے کام لینے کی عادی ہوچکی ہیں۔ اسی لئے اس سہ منزلہ عمارت کی تخلیق میں ان کی سانس پھول گئی ــــ ٹیڑھی لکیر کی دو منزلیں جہاں فنی تکمیل کا بہترین نمونہ ہیں وہاں تیسری منزل میں انتشار ہی انتشار ہے۔ لیکن ٹیڑھی لکیر کی ہیروئن شمو کو ہم اردو کے غیرفانی کرداروں میں جگہ دینے پر مجبور ہیں۔ وہ ابن الوقت ظاہردار بیگ آزاد، خوجی اور امراؤ جان ادا کی برادری کی ایک رکن ہے۔

عزیز احمد کی ہمارے ادب میں کئی حیثیتیں ہیں ــــ نقاد، افسانہ نگار اور ناول نگار ــــ لیکن انہوں نے اُردو ناول کی خدمت اپنے دوسرے ہم عصروں کی نسبت زیادہ دل جمعی اور یک جہتی کے ساتھ کی ہے ــــ اُردو ناول میں انہوں نے بہت سے تجربے

کئے اور موضوعات کی نئی دنیائیں تلاش کیں ـــ "گریز" "لندن کی ایک رات" سے یقیناً متاثر ہو کر لکھی گئی ہے لیکن کہیں زیادہ وسیع پیمانے پر۔ اس ناول کو ہمارے کئی نقادوں نے نعیم کا "جنسی رزمیہ" کہا ہے ـــ مجھے اس سے انکار نہیں کہ جنسی پہلو اس میں غیر مناسب انداز میں اُبھر آیا ہے لیکن عزیز احمد نے مغرب کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کیا، اور اس ناول کا اختتامیہ تو ہمارے ذہن میں مغربی معاشرت کے خلاف شدید ردّ عمل پیدا کر دیتا ہے ـــ عزیز احمد کی ناولیں پڑھتے ہوئے نہ جانے مجھے ہمیشہ یہ کیوں محسوس ہوا کہ وہ اپنی ڈائریوں اور روزنامچوں کو ناول کا روپ دے دیتے ہیں ـــ اس سے ایک فنی نقصان یہ ہوتا ہے کہ بعض شخصی تجربے فنی تجربوں میں نہیں ڈھل پاتے اور اُن کے ذاتی عنصر میں پڑھنے والوں کے لئے ادبی دلچسپی پیدا نہیں ہو پاتی ـــ "آگ" اور "ایسی بلندی ایسی پستی" میرے نزدیک صرف عزیز احمد ہی کی بہترین ناول نہیں بلکہ اُردو کے افسانوی ادب کا بہت قیمتی حصہ ہیں۔

قرۃ العین حیدر اپنے دامن میں نئے تجربے اور نئے اسالیب لے کر اُردو ناول کے ایوانوں میں آئیں اور ان کے آتے ہی نئی

شمعیں جل اٹھیں ـــ "میرے بھی صنم خانے" ایک نئے انداز میں لکھا گیا ـــ ویسے تو یہ امراؤ جان ادا کی طرح تہذیبی ناول ہے لیکن قرۃ العین اور مرزا ہادی کے تصورِ فن میں دو دنیاؤں کا فاصلہ حائل ہے ـــ اس ناول کی سست رفتاری شعوری کوششوں کا نتیجہ ہے اور یہ سُست رفتاری ایک کھوکھلے نظام کی عکاسی کے لئے بے حد ضروری تھی ـــ "سفینۂ غم دل" ہمارے ادب میں اپنے طرز کی واحد ناول ہے، اور شاید مقبولِ عوام (Popular) ناولوں کے اس دور میں اس کی صحیح قدر و قیمت متعین نہ کی جا سکے۔

ڈاکٹر احسن فاروقی اور اے۔ حمید کے نام پچھلے دس سال کی ناول نگاری کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں ـــ ڈاکٹر فاروقی کی ناول "شامِ اودھ" کو فنی طور پر اُردو کا سب سے اچھی ناول کہا گیا ہے۔ میں بھی دوسرے نقادوں کے اس فیصلہ کو تسلیم کر لیتا اگر اس ناول کا اختتام مختلف ہوتا ـــ "سنگم" اور "آشنائی" کی تکنیک اردو کی عام ناولوں سے مختلف ہے ـــ "ہیری" کے اشارہ کے گرد ہیروئن کا کردار آگے بڑھتا ہے۔ "آبلہ دل کا" ان کی نئی ناول ہے۔ یہ ناول پانچ ناولوں کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اور اپنی جگہ مکمل اور قائم بالذات بھی ـــ ڈاکٹر احسن فاروقی کی یہ ناول

ایک تہذیب کا گہرا مطالعہ بھی ہے اور کرداروں کا آئینہ خانہ بھی ــــ یہ "پنج شاخہ" اُردو ناول میں امراؤ جان ادا کے بعد ایک قیمتی تہذیبی و ثقافتی اضافہ ہے۔

اے۔حمید نے تقسیم کے بعد لکھنا شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے قابلِ رشک مقبولیت حاصل کر لی ــــ ان کی مقبولیت نوجوانوں کے طبقہ میں زیادہ ہے اور اسی بات سے اُن کی خوبیوں اور کمزوریوں کا اندازہ ہو سکتا ہے ــــ اے حمید کو حجاب امتیاز علی تاج کا جدید اڈیشن کہنا تنقیدی بددیانتی ہے ــــ اے۔حمید یقیناً رومانی افتادِ طبع رکھتا ہے لیکن یہ افتادِ طبع جدید ہے ــــ ایک ایسے نوجوان کی افتادِ طبع جس کے رومانی خوابوں پر بھی دوسری جنگِ عظیم کے سائے چھائے ہوئے ہیں ــــ "ڈربے" اے۔حمید کی پہلی ناول ہے۔تقسیم کے بعد نئے وطن میں مہاجرین کی زندگی کا ہر نقش اس ناول میں بڑی صداقت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اور رومانی اے۔حمید اس ناول میں تلخ حقیقت نگار نظر آتا ہے ــــ اُس کی ناولٹ "جہاں برف گرتی ہے" اپنے اندازِ بیان کی بناء پر جدید ترنسل کے لکھنے والوں کی تمام تحریروں میں بہت اونچا درجہ رکھتی ہے ــــ "جنگل روتے ہیں" اے۔حمید کی ایک اور اچھی ناول ہے لیکن

اپنے دوسرے ناولوں میں وہ سہل پسندی کا شکار ہو گیا ہے۔ ان ناولوں کی کہانیاں بنیادی طور پر مختصر ہیں اور انہیں اس طرح بڑھا کر اور کھینچ کر لکھا گیا کہ ان کا تاثر زائل ہو گیا اور کرداروں کا ارتقا تو ملتا ہی نہیں۔

اشفاق احمد کی ناولٹ "مہمانِ بہار" ایک بڑی گرم اور جارحانہ محبت کی کہانی ہے ـــــ اس کی ہیروئن ہمارے افسانوی ادب کی سہمی اور جھجکی ہوئی خواتین سے بالکل مختلف ہے۔ اسی طرح غلام عباس کی ناول "گوندنی والا تکیہ" قابلِ ذکر ہے۔ اس میں پنجاب کے قصباتی تمدن کی جو تصویریں ملتی ہیں وہ اس سے پہلے پنجاب کے کسی فن کار نے پیش نہیں کی تھیں ـــــ غلام عباس نے اردو ادب کے حضور ایک نیا پنجاب پیش کیا ہے اور غالباً پنجاب کی روح یہی ہے۔

ابو سعید قریشی اور صلاح الدین اکبر کے نام بھی اس دور کے ناول نگاروں میں نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ فسادات اور تعلیم کے موضوع پر دو قابلِ توجہ ناول لکھے ۔ انتظار حسین کا "چاند گرہن" اور رامانند ساگر کا "اور انسان مر گیا" ـــــ انتظار حسین نے مسائل کو گہری نظر سے ضرور دیکھا لیکن ناول کے فنّی پہلو پر زیادہ توجہ نہ دی۔ نثار عزیز صاحبہ نے "نگری نگری پھرا مسافر" لکھ کر اچھے ناولوں

کی تعداد میں ایک ناول کا اور اضافہ کیا ہے ـــ ابھی ان کے ادبی سفر کی ابتدا ہے اور ان سے توقعات وابستہ کرنے میں کوئی ایسا ہرج نہیں۔

مقبولِ عوام (Popular) ناولیں کثرت سے جا رہی ہیں اور خوب بکتی ہیں ـــ جاسوسی ناولوں کو بے حد فروغ حاصل ہوا ہے۔ کئی ماہنامے ہر ماہ مکمل جاسوسی ناول شائع کرتے ہیں۔ مثلاً ہندوستان سے جاسوسی دنیا، جاسوسی کارنامے اور پاکستان سے سلطان اور آتش ـــ ایم۔ اسلم، رئیس احمد جعفری، قیسی رام پوری، رشید اختر ندوی، عادل رشید اور نسیم حجازی کی بہت سی ناولیں اس عرصہ میں شائع ہوئیں۔ طبع زاد جاسوسی ناول نگاروں میں ابنِ صفی سب سے زیادہ مقبول ہوئے۔

جاسوسی اور سستی ناولوں کے اس فروغ کی وجہ لوگوں کا ذہنی فرار ہے جو سنسنی خیز حالات میں گم ہو کر اپنے ماحول سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور یہ افیون ناول کے سوا اور کہاں ملے گی؟ ـــ اور یہ کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔

ڈرامہ

اُردو ناول کا نقاد جدید اُردو ناول کے سلسلہ میں چند کارناموں پر تو فخر کر سکتا ہے لیکن اُردو ڈرامے کی دنیا میں "انار کلی" کے بعد سناٹا ہے ـــــ یہاں میری مراد اُردو ڈرامہ سے "طویل ڈرامہ" ہے ـــــ امتیاز علی تاج کی انار کلی جدید اُردو ڈرامہ کی سب سے بڑی فتح ہے ـــــ اس کے بعد پروفیسر مجیب اور اشتیاق حسین قریشی وغیرہ نے کالج کے طلبا کے لئے ڈرامے لکھے اور فن سے زیادہ افادیت پر زور دیا گیا۔

پچھلے دس سال کے اُردو ڈرامہ کا مطالعہ "یک بابی" تمثیلوں اور ریڈیائی ڈراموں کا مطالعہ ہے ـــــ ریڈیو کے ساتھ یک بابی ڈرامے مقبول ہوئے اور یوں سماعت تمام حواسِ خمسہ کا بدل بن گئی اسی لئے جب ایسے ڈرامے اسٹیج پر پیش کئے جاتے ہیں تو ان میں عمل اور حرکت کی کمی بے طرح محسوس ہوتی ہے ـــــ بہرحال اس سے انکار ممکن نہیں کہ ریڈیو کی وجہ سے ہمارے بہترین فن کار ڈرامے کی طرف متوجہ ہوئے ـــــ کرشن چندر اور منٹو تو ریڈیو سے متعلق ہی تھے، اور اسی لئے ان دونوں نے کتنی بہت اہم ڈرامے لکھے ـــــ بڑی بات یہ کہ دونوں کے ڈراموں میں ان کے افسانوں کی

خوبیاں موجود ہیں اور ان کے مزاج کی ترجمانی ان تمثیلوں میں
بھی کامیابی کے ساتھ ہوئی ہے — کرشن کے ڈراموں میں چاندنی
جیسی اُجلی نثر، وسعت اور انسان دوستی ہے۔ منٹو کے یہاں
Suspense اور زندگی کا شعور ہے — عصمت نے گنتی کے
چند ڈرامے لکھے لیکن ان کے مکالموں میں جو چٹیلا پن اور تلوار کی
سی کاٹ ہے وہ کہیں اور نہیں — یہ مکالمے ناگن کی لہکتی ہوئی
زبان کے ساتھ ساتھ برناڈ شا کی تقلید اور کہیں کہیں نقالی کا
احساس دلاتے ہیں — راجندر سنگھ بیدی نے سات کھیل لکھے
اور یہ ساتوں ڈرامے ان کی بے پناہ مضبوط اور انفرادی شخصیت کا
احساس دلاتے ہیں۔ "رخشندہ" اور "نقل مکانی" میں ڈرامائی عمل اور
حرکت کے ساتھ ساتھ داخلی کش مکش بھی بڑے سلیقہ سے سمودی گئی
ہے۔ بیدی کے مکالمے حد درجہ فطری گفتگو پیش کرتے ہیں۔ ان کے
کردار اگر اسٹیج پر آکر بولنے لگیں تو یہی محسوس ہوگا جیسے یہ مکالمے
کبھی کاغذ پر نہیں لکھے گئے تھے — ان فن کاروں کے علاوہ
سید امتیاز علی تاج، انصار ناصری، شاہد احمد دہلوی، انتصار حسین،
رفیع پیرزادہ، عشرت رحمانی، عابد علی عابد اور اصغر بٹ وغیرہ
نے اچھے ریڈیائی ڈرامے لکھے — عصمت، کرشن، بیدی، منٹو

خواجہ احمد عباس، کمال امروہوی اور راماننداساگر وغیرہ نے اچھے فلمی ڈرامے لکھے۔

اوپندر ناتھ اشک، میرزا ادیب، ناصر شمسی اور جاوید اقبال کا ذکر میں علیٰحدہ کرنا چاہتا ہوں کیونکہ ان لوگوں نے ڈرامہ کی طرف خاص توجہ کی اور اسے اپنے مشغلوں میں سے محض ایک مشغلہ نہ سمجھا —— اوپندر ناتھ اشک ریڈیو کے ساتھ ساتھ اسٹیج کی تکنیک سے بھی گہری آگاہی رکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کے ڈرامے ادبی اور فنی دونوں معیاروں پر پورے اترتے ہیں۔ "قید حیات" اردو کے بہت اچھے ڈراموں میں سے ہے —— جاوید اقبال اردو ڈرامہ کی دنیا میں ایک ننھے سے پیغمبر کی طرح ایک نئی شریعت لے کر آیا تھا لیکن نہ جانے یہ ستارہ کہاں ڈوب گیا، اور وہ شریعت سرگوشی بن کر فضا میں کھو گئی —— ناصر شمسی کی تمثیلوں کا مجموعہ "سحر ہونے تک" اُن کی تخلیقی صلاحیتوں کا بہت اچھا اظہار ہے۔ لیکن وہ بھی معاش اور پیٹ کی وادیوں میں کھو گئے —— "تیرے کوچہ سے ہم نکلے" اردو کا سب سے اچھا تہذیبی ڈرامہ ہے اور اس کا پس منظر ۱۹۴۷ء کا فسادِ دہلی ہے —— فسادات کے موضوع پر افسانے تو بہت لکھے گئے۔ ناول بھی تحریر ہوئے لیکن ڈرامے کو

اظہار کا وسیلہ اتنے سلیقہ سے صرف ناصر شمسی نے بنایا ـــــ لیکن یہ سب کل کی باتیں ہیں۔ آج یک بابی ڈرامہ کے سلسلہ میں سب سے قابلِ احترام نام میرزا ادیب کا ہے ـــــ تقسیم کے بعد میرزا ادیب نے پابندی سے ڈرامے لکھے ہیں اور ان کے ڈراموں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں ـــــ میرزا ادیب کے کچھ ڈرامے داخلی جذبات کی بنیادوں پر لکھے گئے ہیں جن کی فضا میں میٹھے میٹھے خوابوں کی کیفیت ہے ـــــ ایسے خواب جو ایک شیریں درد سے معمور ہیں لیکن ان کے زیادہ ڈرامے ہمارے بعض اہم سماجی مسائل سے متعلق ہیں۔ مثال کے طور پر باز یافتہ خواتین کا مسئلہ مہاجرین کا مسئلہ ـــــ

ریڈیائی ڈراموں نے اس دور میں کافی فروغ پایا لیکن طویل ڈرامے اس لئے نہیں لکھے گئے کہ ہمارے یہاں ترقی یافتہ اسٹیج نہیں (بلکہ اسٹیج ہی نہیں) "انڈین پیپلز تھیٹر"، اور "پرتھوی تھیٹر" نے ضرور ڈرامے کی نئی زندگی کے لئے سازگار فضا اور ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی ـــــ ان کے ڈراموں میں "غدار"، "دیوانہ" "پٹھان" "یہ کس کا خون ہے؟" (سردار جعفری) اور بیمار (سجاد ظہیر) کافی اہم اور مشہور ہیں۔

—— کراچی میں شوقیہ کام کرنے والوں نے بھی اسٹیج کے احیا کے لئے جدوجہد کی۔ اور یہ کوششیں بڑی حد تک معیاری ثابت ہوئیں۔ "زوالِ حیدرآباد"، "نیا نشان"، "لال قلعہ سے لالوکھیت" اور "سٹک عید" اچھے ڈرامے تھے اور ان کی پیش کش بھی نئے اسالیب فن کا سراغ لگانے میں مدد دیتی ہے —— خواجہ معین الدین کے تینوں ڈراموں کو عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اگر خواجہ صاحب "وحدتِ عناصر" پر زیادہ زور دیتے تو فنی اور ادبی طور پر ان کی تمثیلیں اور زیادہ بلند ہو جاتیں۔

طنز و مزاح

"طنز و مزاح" اُردو ادب میں جنسِ نایاب ہو چلا ہے —— جہاں کبھی فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس اور عظیم بیگ چغتائی کے مشاہدے، مسکراہٹیں اور قہقہے تھے وہاں اب خاموشی ہے —— بڑے تلخ اور غیر متوازن حالات اگر سوئفٹ جیسے فن کاروں کے یہاں طنز کی روح بیدار کر دیتے ہیں تو یہی حالات اوسط درجے کے لکھنے والوں سے توازن اور نظم و ضبط چھین لیتے ہیں —— آج ہمارے ادب کی بھی یہی

کیفیت ہے — طنز و مزاح کے پل صراط سے صحیح سلامت گزر جانے والے خال خال ہیں۔

گزشتہ دس سال کے طنزیہ ادب میں سب سے وقیع نام کنہیالال کپور کا ہے۔ کپور اس دور کے واحد طنز نگار ہیں۔ ویسے تو مزاحیہ عنصر کی جھلک اچھے طنز نگاروں میں ہوتی ہی ہے — کپور اس زندگی کے تضاد اور اس کی بوقلمونی پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کی علمیت ان کے وار کی شدت بڑھا دیتی ہے — اور ان کا طنز تیر نیم کش کی طرح دل میں پیوست رہتا ہے — ان کے یہاں ملکی حالات کے پیش نظر جو جذباتی اُبال پیدا ہو گیا ہے وہ کوئی اچھی یا صحت مند چیز نہیں — "گیارہ کھاتہ" اور "برج بانو" — ان کے یہ دو مضامین ان کی اس دور کی تحریروں میں ادبی معیار پر پورے اُترتے ہیں۔

شوکت تھانوی کے مزاح میں تقسیم کے بعد وسعت اور گہرائی پیدا ہوئی، سماجی مطالعہ نے ان کے مزاح میں طنز کا پہلو پیدا کر دیا۔ لیکن شوکت بھی کچھ عرصہ کے بعد "قاضی جی" کی بھینٹ چڑھ گئے۔

ابراہیم جلیس کی افسانہ نگاری جہاں تقسیم کے بعد تقریباً

ختم ہوگئی وہاں وہ ہمیں ایک طنز نگار کے روپ میں نظر آتا ہے۔ اُس کی طنزیہ تحریریں اخباروں کے لئے تھیں لیکن پھر بھی ان میں اچھے ادبی عنصر کی کمی نہ تھی۔ جلیس نئی بات پیدا کرنا جانتا ہے پھر اس کے قلم میں تلوار کی سی بُرّش بھی ہے ــــ یہ دونوں عناصر اس کی طنزیہ تحریروں کو بے مزا نہیں ہونے دیتے۔

رومانی شاعر "ابن انشا" نے بھی اس میدان میں اچھی نگارشات پیش کیں ــــ "معاہدہ چانگا مانگا" کو تو اردو طنز و مزاح کے ہر اچھے انتخاب میں جگہ دینی ہوگی انشا نے اسٹفن لیکاک سے متاثر ہوکر اس کے تتبع میں کافی لکھا ــــ قومی زبان میں "میر جملہ" کے قلمی نام سے انہوں نے ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ "مولوی صاحب کی ڈاک" ــــ ادبی اور علمی مسائل میں طنز کی چاشنی اس سلسلہ میں بڑے سلیقہ سے ملتی ہے۔

شفیق الرحمن اب بھی کبھی کبھی اپنی شگفتہ تحریروں کے ذریعے اپنی ذہانت کا اظہار کرتے رہتے ہیں ــــ نئے طنز نگاروں میں محمد خالد اختر میں کافی صلاحیت ہے۔

روزناموں میں طنز و مزاح کا کالم مستقل حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ چراغ حسن حسرت مرحوم کا نام اس سلسلہ میں سب

سے زیادہ امتیاز رکھتا ہے۔ سندباد جہازی نے اپنے آخری سفر پر جانے سے پہلے بہت کچھ لکھا۔ انہیں زبان پر جو قدرت تھی اس کی وجہ سے ان کے مزاحیہ کالموں میں دلچسپی اور ادبیت کا عنصر بہت زیادہ ملتا ہے —— عبدالمجید سالک کے "افکار و حوادث" بھی قابلِ ذکر ہیں۔ سالک صاحب کے یہاں مزاح سے زیادہ طنز ہے —— طفیل احمد جمالی تو اُردو صحافت کے بُت شکن ہیں —— ان کی تحریروں میں ادبی چاشنی بھی ہے۔ اور سیاسی شعور بھی —— مجید لاہوری اور رئیس امروہوی کی مزاحیہ نظم ونثر کا "جنگ" کی مقبولیت میں بڑا حصہ ہے۔

اُردو نظم میں طنز کا رنگ تو بدلتے ہوئے سیاسی حالات نے کافی شوخ کر دیا۔ اِس طنز کے حدود کافی وسیع ہیں — سرمایہ دار سے لے کر خالقِ کائنات تک، لیکن ہمارے نئے شاعر کبھی کبھی اپنے غم وغصّہ کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کا طنز اپنی قوت کھو بیٹھتا ہے —— وہ تمام شعرا جن کے یہاں طنز کے عناصر موجود ہیں ان کا ذکر یہاں ممکن نہیں —— شاؔد عارفی اور علی منظور حیدر آبادی اس میدان میں مخصوص طرزِ ادا اور اندازِ فکر کے مالک ہیں —

شادؔ نے ہمارے معاشرے، رسوم، تقریبات اور خود فریبیوں پر بہت اچھی نظمیں لکھی ہیں ـــ عہدِ حاضر کے مزاح گو شاعروں کے سرگروہ سیّد محمد جعفری کی شاعری میں کتنے ہی نئے عناصر ہیں ـــ اقبالؔ کی شاعری سے انہوں نے شعوری طور پر فائدہ اٹھایا اور اس سے ایک اہم تضاد سامنے آجاتا ہے ؎

الاٹ منٹ ہیں یاروں کی آستینوں میں
نہ ہے زماں، نہ مکاں لا الٰہ الّا اللہ!

جعفری کے یہاں شعر کے بہت سے محاسن ہیں، اور مزاح میں تغزّل کی شان پیدا کرنا تو انہی کا حصّہ ہے مثلاً نمائش کا یہ شعر ؎

مائیکروفون سے آتے ہیں زلیخا کے پیام
اے مرے یوسفِ گم گشتہ تجھے میرا سلام

ادبی رسائل و اخبارات

ادبی صحافت نے گزشتہ دس سال میں بہت زیادہ ترقی حاصل کی ـــ اس دور میں ہمیں جتنے اچھے رسالے نظر آتے ہیں اس کی مثال کسی پہلے دور میں مشکل سے ملے گی ـــ تمام ادبی تحریکات کو انہی رسالوں نے آگے بڑھایا ـــ کچھ

دنوں تک ترقی پسند تحریک سے وابستہ رسالوں نے "ادبی احتساب" کی بنا پر تنگ نظری کا ثبوت دیا لیکن جلد ہی وہ اعتدال پر آ گئے ——— عام ادبی انحطاط کے باوجود ان رسالوں نے اچھا ادبی معیار برقرار رکھنے کی جدوجہد کی، اور اس کے لئے یہ قابلِ تبریک ہیں ——— رسالوں کے خاص نمبروں میں جو جدت اور تنوع نظر آتا ہے وہ بھی معاملہ کا ایک موضوع ہے۔

پرانے رسالوں میں "اُردو" "ہمایوں" "نیرنگِ خیال" "ادبی دنیا" "معارف" "ساقی" اور "زمانہ" قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن عالمگیر اور نیرنگِ خیال" کا ادبی معیار پست تر ہوتا چلا گیا ——— "زمانہ" ۱۹۴۷ء میں بند ہو گیا ——— ساقی نے تمام مشکلات پر فتح پائی اور شاہد صاحب نے اسے اپنے خونِ جگر سے سینچا ——— ساقی کا جوبلی نمبر اس کے عظیم ماضی کی طرف بہت ہی حوصلہ افزا مراجعت ہے ——— "مخزن" کا از سرِ نو اجرا ہوا لیکن جلد ہی مخزن پھر بند ہو گیا ——— حامد علی خاں نے مخزن کے بعد الحمراء نکالا اور یہ رسالہ ایک مخصوص علمی روایت کو آگے بڑھاتا ہے ——— معارف شبلی و سلیمان اور ندوۃ العلما کی علمی و ادبی روایات کا باوقار ترجمان ہے ——— "العلم" کراچی

کے دامن میں تعلیم و ادب دونوں ہیں ـــــ بمبئی کا "نوائے ادب" اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔ اس سہ ماہی رسالہ میں اُردو رسائل کے مضامین کی جو فہرست اور خلاصہ شائع ہوتا ہے وہ تحقیقی ذوق رکھنے والوں کے لئے بڑے کام کی چیز ہے ـــــ رسالہ اُردو ادبی تحقیق و تنقید کے لئے مخصوص ہے اور مولوی عبدالحق کی ادارت میں اس نے اپنے معیار کو باقی رکھا ہے ـــــ "نگار" آج بھی نیاز فتحپوری کی شوخیٔ تحریر اور مخصوص انداز کی بنا پر اپنے حلقہ میں دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ ادبی دنیا کو مولانا صلاح الدین نے ایک وقفۂ تعطّل کے بعد اکیڈیمی پنجاب کے زیرِ اہتمام پھر شائع کرنا شروع کیا ہے ـــــ ادبی دنیا آج بھی اپنی روش خاص پر گامزن ہے۔

ان پُرانے رسالوں کے علاوہ اُردو کے کئی بہت اچھے رسالے اِنہیں دس سالوں کی پیداوار ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں "افکار" بھوپال سے جاری ہوا۔ اس پرچہ نے وسطی ہند میں اردو کے جدید ادب کا مذاق پیدا کیا اور ترقی پسند تحریک کو نئی تاب و توانائی دی ـــــ تقسیم کے بعد' افکار' کراچی سے نکالا گیا، اور اس نے پاکستان کے علاقائی ادب کو خاص اہمیت دی

"نقوش" اور "سویرا" کو ہم جدید ادبی صحافت کا ارتقاء کہہ سکتے ہیں۔ نقوش نے نئی طرحیں ڈالیں — اس کا "غزل نمبر" اور "شخصیات نمبر" — یہ دونوں اپنی کمزوریوں کے باوجود ہمارے ادب میں یادگار رہیں گے — بمبئی سے ترقی پسند تحریک کے سرکاری ترجمان کی حیثیت سے "نیا ادب" دو ایک سال جاری رہ کر بند ہو گیا — "نیا دور" نے ممتاز شیریں اور صمد شاہین کی ادارت میں جدید ادب میں اہم اضافے کیئے — نیا دور کے دو نمبر 'بنگالی ادب نمبر' اور 'فسادات نمبر' عرصہ تک یاد کیئے جائیں گے۔ لیکن یہ رسالہ بھی حالات کا مقابلہ نہ کر سکا۔

تقسیم سے پہلے ہندوستان سے کئی قابلِ ذکر رسالے نکلے اور بند ہو گئے۔ ان میں خیال بمبئی (میراجی اور اختر الایمان) اضطراب لکھنؤ (نسیم سندیلوی)، مضراب کانپور اور منادر لکھنؤ (شوکت صدیقی) قابلِ ذکر ہیں — مضراب نے ادب وقلم کا جو سنجیدہ امتزاج پیش کیا، وہ اس کے بعد کسی رسالے میں نہیں ملتا — دورانِ جنگ میں حکومتِ ہند نے اپنے پروپیگنڈے کے لیئے "آج کل" نکالا، لیکن 'آج کل' ایک اچھے ادبی معیار کا

رسالہ تھا۔ اس رسالہ میں ہمارے ادیبوں نے دلچسپی لی، کیونکہ یہ معقول معاوضہ دیتا تھا ـــــ تقسیم کے بعد حکومت پاکستان نے ماہِ نو جاری کیا ـــــ ماہِ نو میں براہِ راست پروپیگنڈا نہیں کیا گیا بلکہ پاکستانی تہذیب و تمدّن کے ساتھ اچھا ادب بھی پیش کیا گیا ـــــ وقار عظیم، حسن عسکری، فضل قریشی اور رفیق خاور نے ماہِ نو کو ایک معیاری رسالہ بنا دیا۔

تقسیم کے بعد پاکستان کے تقریباً تمام صوبوں سے اچھے ادبی رسائل جاری ہوئے ـــــ سرحد سے "سنگِ میل" اور "زندگی" ـــــ مشرقی پاکستان سے ڈاکٹر عندلیب شادانی نے "خاور" جاری کیا۔ خاور کے ذریعہ بنگالی کے موجودہ ادیبوں کے افکار اُردو والوں تک پہنچے۔ اسی لئے خاور کا بند ہو جانا ایک ادبی نقصان ہے ـــــ لاہور سے اوراقِ نو، ماحول، جاوید وغیرہ رسالے شائع ہوئے مگر ان کو چند روزہ زندگی ملی۔ "اُردو ادب" اور "خیال" کے چند ہی شمارے شائع ہوئے لیکن ان کا کیف آج بھی باقی ہے ـــــ یہ دونوں رسالے ان ادبی پرچوں میں سے تھے جو اپنے مرتّب کرنے والوں کی شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں ـــــ محمد حسن عسکری اور منٹو

اُردو ادب کے مُدیر تھے ــــ "خیال" کو میراجی کی روایات کی بقا کے لئے انتظار حسین اور ناصر کاظمی نے نکالا ــــ "دستور" بھی لاہور کا قابلِ ذکر پرچہ تھا ــــ حلقۂ اربابِ ذوق نے "نئی تحریریں" کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اور اب تک اس کے دو شمارے شائع ہو چکے ہیں ــــ فیض احمد فیض کا "سحر" صرف دو شمارے پیش کر سکا۔

کراچی سے ساقی، افکار اور ماہ نو کے علاوہ "ادب" اور "مشرب" جاری کئے گئے۔ ادب تو اب کبھی کبھار شائع ہوتا ہے لیکن مشرب پابندی سے شائع ہوتا ہے، اور اس کا ادبی معیار بھی غنیمت ہے ــــ "سیّارہ" نے اُردو رسالوں کی صف میں اپنی خوب صورتی اور آرٹ اپ کی بنا پر امتیاز حاصل کر لیا۔ "فانوس" بھی اسی حُسن و خوبی کو پیشِ نظر رکھ کر جاری کیا گیا ہے ــــ کراچی سے "مہرِ نیمروز" ایک نیا پرچہ جاری ہوا ہے۔ ابھی تین شمارے سامنے آئے ہیں اور ان میں بلند ادبی معیار ملتا ہے ــــ "چہ دلا دست" "رسالوں میں" اور "پہلی کرن" اس رسالہ کی خصوصیات ہیں۔

تقسیم کے بعد ہندوستان سے "شاہراہ" "تہذیب" اور

"فن کار" جیسے اچھے پرچے شائع ہوئے ——— "شاہراہ" کے ابتدائی شماروں اور فن کار کے دو شماروں کا معیار ہر لحاظ سے بلند پایہ تھا ——— علی گڑھ سے ایک بہت اچھا نیا رسالہ "فکر و نظر" شروع ہوا ہے ——— "تحریک" "صبا" اور "کردار" بھی ہندستان کے نئے رسالوں میں قابلِ ذکر ہیں ——— انجمن ترقیٔ اردو (ہند) نے "اُردو ادب" نکالا۔

ویسے تو اُردو صحافت کی دنیا میں بہت سے اچھے ہفت نامے نظر آتے ہیں لیکن ان ہفت روزہ اخبارات میں نظام بمبئی اور شاہد بمبئی زیادہ ادبی تھے ——— ادارۂ شمع نے ایک نیا ہفت روزہ "آئینہ" جاری کیا ہے ——— اس سے خوب صورت ہفت روزہ اُردو میں اس سے پہلے شائع نہیں ہوا ——— آئینہ کے دامن میں بڑا تنوع ہے اور اس کا ہر شمارہ ترقی کی طرف ایک قدم!!

حرفِ آخر

یہ کتابچہ بڑی تاخیر کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اس کے اسباب نہ پوچھئے ——— پھر شاید اس بات سے آپ کو کچھ ایسی دلچسپی بھی نہ ہو گی۔

اور آج جب میں نے اِن صفحات کو دوبارہ پڑھا تو پتہ چلا کہ اردو ادب کا قافلہ اِن منزلوں سے کہیں آگے بڑھ گیا ہے ـــ مگر آپ ہی بتایئے کہ زندگی اور ادب کس کی گرفت میں آئے ہیں۔ جو میری گرفت میں آئیں گے۔

اس کتابچہ کا پہلا تنقیدی جائزہ ۵۰ء میں لکھا گیا تھا، اس کی نوعیت تاریخی ہے، اسی لئے اُس میں ردو بدل کی کوئی ضرورت نہیں دوسرا جائزہ ۵۶ء میں مرتب کیا گیا تھا اور آج ۶۲ء میں وہ اپنی ناتمامی کا نقشِ فریادی بن گیا ہے۔

چھ سال کی مدت میں کئی فن کار اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئے۔ جن کا دوسرے جائزہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ کئی پرچے

بند ہوگئے، کئی نئے رسالے جاری ہوئے ہیں ــــــ اور بعض ادبی کارنامے بھی پیش کئے گئے ہیں۔

اس عرصہ میں اردو ناول میں کئی اہم اضافے ہوئے ہیں "آگ کا دریا"، "علی پور کا ایلی"، "سنگم" اور "معصومہ"۔ آگ کا دریا ناول بھی ہے اور ثقافتی تاریخ کا تسلسل اور مشاہدہ بھی ــــ یہ تاریخ نہیں ہے ناول ہے اور اسی لئے اس سے ایک بند دروازہ اردو میں کھلتا ہے۔ علی پور کا ایلی ایک زندگی کی کہانی ہے مگر ایلی محض ایک فرد نہیں ہے، ایک دور بھی ہے۔ شاید اب ہم میں اور ہمارے نقادوں میں زیادہ صفحات پڑھنے کا حوصلہ نہیں رہا (زیادہ صفحات لکھنے میں ہمارے نقاد کسی سے پیچھے نہیں بلکہ اسے ادبی "عبادت" جانتے ہیں) اسی لئے ممتاز مفتی کو اپنی کاوش کی داد بھی نہ مل سکی ممتاز مفتی بنیادی طور پر افسانہ نگار سمجھے جاتے ہیں لیکن اپنے ناول میں "ایلی" کی ذہنی اور خارجی شخصیت کی تعمیر کی خاطر انہوں نے تفصیلات اور جزئیات کو بڑی چابک دست کے ساتھ پیش کیا ہے ممکن ہے کہ "ذہن کے سپاہی کی جنگ" کل کے باغیوں اور آج ادب کے ثقہ ادبی ججوں کو پسند نہ آئی ہو اور ممتاز مفتی اسی لئے ایک ادبی انعام سے محروم کئے گئے۔ اس ناول کے نسوانی کرداروں

میں ایک ایسی "نسوانی جارحیت" ملتی ہے، جو علیحدہ گفتگو کا موضوع ہے ——— "سنگم" آگ کا دریا کا جواب ہے مسلم کے کردار میں توانائی بھی، تسلسل بھی ——— لیکن تاریخ ہر جگہ فن نہیں بن سکی ہے۔

افسانہ میں بھی بعض فن کاروں نے اُس وعدہ کو بڑی حد تک پورا کردیا ہے جو اُن کی آمد نے ہم سے کیا تھا۔ ان نوخیزوں کے فن میں بلوغ کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے ——— اس وقت یہ سطریں لکھتے ہوتے مجھے اس ضمن میں ایک نام خاص طور پر یاد آرہا ہے ——— اور وہ واجدہ تبسم کا نام ہے اور پرانے افسانہ نگاروں میں اس چھ سال کی مدت میں بیدی، عصمت اور بلونت سنگھ نے نئی منزلوں کا سراغ پالیا ہے۔ میری ناچیز رائے میں بیدی کے افسانہ "اپنے دُکھ مجھے دیدو" سے اردو افسانہ کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

خاکہ نویسی ہمارے ادب میں اب ایک محترم اور اہم صنف بن گئی ہے ——— اس کی جڑیں ہماری ادبی زمین میں زیادہ گہری ہوگئی ہیں۔ شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کا مجموعہ "گنجینۂ گوہر" اس صنف میں ایک اہم اضافہ ہے۔ جوش ملیح آبادی کے خاکہ میں "دیدہ" کے ساتھ اگرچہ "شنیدہ" بھی شامل ہے ——— مگر اس خاکہ نے "دورخی"

کی واقعیت اور معروضیت کی روایت کو اور آگے بڑھا دیا ہے۔ شاہد صاحب آدمی سے محبت کرتے ہیں ـــــ وہ اپنے دوستوں اور جاننے والوں کو اُن کی ساری خوبیوں اور کمزوریوں کے ساتھ قبول کرتے ہیں ـــــ اسی لئے ان کے خاکے یک رُخے اور سپاٹ نہیں ہیں۔

مجھ میں نہیں آتا کہ اِن آخری چار مختصر سے صفحوں میں آپ سے اور کیا کہوں ـــــ اردو والے خاصے اہم کاموں کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں ـــــ لسانیات خاص طور پر عملی لسانیات اور اور اردو کے لسانی مسائل پر ڈاکٹر شوکت سبزواری کی کتاب بھی شائع ہوئی ہے۔ ترقی اردو بورڈ کی لغت کی اشاعت کا کام شروع ہو گیا ہے۔ ترقی اردو بورڈ، اکادمی پنجاب، اردو اکیڈمی سندھ کراچی اور مجلس ترقی ادب وغیرہ نے کلاسیکی ادب کی اشاعت، ترتیب اور تہذیب کو اب فنی مرتبہ عطا کر دیا ہے ـــــ سستی کتابوں کا دور شروع ہو گیا ہے۔ اور شاید لوگ اب ادب پڑھنے بھی لگے ہیں۔ رسالوں میں ہم قلم، اور بصائر کا اضافہ قابل قدر ہے ـــــ

مشتاق احمد یوسفی کے مضامین کے مجموعہ "چراغ تلے" نے یہ ڈھارس بندھائی ہے کہ ابھی ہم میں مسکرانے کی صلاحیت باقی ہے اُن کی مزاح نگاری "نقشِ مکرر" نہیں ہے۔ وہ رشید احمد صدیقی اور

پطرس کی یاد ضرور دلاتے ہیں۔ مگر ان کی ہر سطر ہم سے یہ بھی کہتی ہے کہ یوسفی ہمارے طنز و مزاح کو ایک نیا مزاج دینے آئے ہیں۔

اور باقی ہر طرح سے خیریت ہے ——— مگر؟.....

.....اس "مگر" کی تلاش میں، میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں اور میری واپسی تک آپ بھی "مگر" پر غور فرمائیں۔

آپ کا
کشفی

نوٹ۔ گزشتہ چھ سال کے اہم شاعروں میں نظم نگار کی حیثیت سے عبدالعزیز خالد اور غزل گو کی حیثیت سے سجاد باقر رضوی کے ناموں کا اضافہ میرے جائزے میں کر دیجئے۔

صوفی تبسم، عابد علی عابد، فضل احمد کریم فضلی، حنیف فوق، فاروق محشر بدایونی، شاعر لکھنوی، ساقی فاروقی، منظفر علی سید، قمر جمیل اور صہبا اختر کا ذکر میں روا روی میں نہیں کرنا چاہتا۔ ان میں سے بعض فن کار اہم ہیں اور بعض ہمارے ادب کے لئے مستقبل کے وعدے کی حیثیت رکھتے ہیں

کشفی

۱۹ر ستمبر ۶۲ء

مصنف کی تین نئی کتابیں

حسرت کی تنقید

حسرت اردو غزل کی دو صدیوں کے نمائندے ہیں۔ حسرت کے تنقیدی شعور اور اردو شاعری کے گہرے مطالعہ نے انہیں یہ حیثیت عطا کی ہے۔

حسرت بہت بڑے شاعر تھے اور بڑے نقاد، ادب کے اچھے شارح اور اہم تذکرہ نگار بھی تھے، انکے تنقیدی اشارے ہمارے سامنے ایک جہانِ معنی پیش کر دیتے ہیں۔

سید ابوالخیر کشفی پہلی بار حسرت کی تنقید کا انتخاب پیش کر رہے ہیں۔ اس مجموعہ کے ساتھ حسرت کا ایک خاکہ، اُن کی تنقید کا جائزہ اور تنقیدی ملفوظات بھی شامل ہیں۔ یہ کام حسرت کے حکم کے تحت ان کی زندگی میں شروع کیا گیا تھا —— اور ناخن کا یہ قرض ان کی وفات کے ۱۲ سال بعد ادا ہو سکا ہے۔

مجالس رنگیں

سعادت یار خاں رنگیںؔ کی نہایت اہم فارسی کتاب مجالس رنگیں کو سید ابوالخیر کشفی نے اردو میں منتقل کیا ہے۔ کتاب کے ساتھ مفصل مقدمہ اور نہایت اہم تذکرۃ الرجال بھی شامل ہے، جس میں مجالس رنگیں کی شخصیتوں کے حالات پیش کئے ہیں۔

یہ کتاب اردو میں ترجمہ اور ترتیب کا ایک بلند معیار قائم کرتی ہے۔

باغ و بہار

باغ و بہار۔ میر امن کا کارنامہ ہی نہیں ہے بلکہ اردو نثر کی مادر مہربان ہے جس کے دامن کی ہواؤں میں ہماری نثر نے بالیدگی حاصل کی۔

سید ابوالخیر کشفی نے اس ایڈیشن کے متن کا مقابلہ تمام معتبر نسخوں سے کیا ہے۔ کم و بیش نو سو حواشی متن کے ساتھ درج کئے گئے ہیں اور اس ایڈیشن کا مقدمہ باغ و بہار کی روح تک آپ کو پہنچنے میں مدد دے گا ——— باغ و بہار کا یہ ایڈیشن تمام گزشتہ ایڈیشنوں پر ایک اضافہ کا درجہ رکھتا ہے۔

ہماری تنقیدی کتابیں

چند ہم عصر	بابائے اردو مولوی عبدالحق	۶.۵۰
نئے اور پرانے چراغ	آلِ احمد سرور	۵.۰۰
دکنی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر محی الدین زور	۴.۲۵
مذہب اور اس کا اثر اردو شاعری پر	ڈاکٹر سید اعجاز حسین	۵.۵۰
مختصر تاریخ ادب اردو	〃 〃 〃	۷.۰۰
لکھنؤ کا دبستان شاعری	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	۲.۵۰
غزل و متغزلین	〃 〃 〃	۴.۵۰
تجربے اور روایت	〃 〃 〃	۳.۲۵
داستان سے افسانے تک	سید وقار عظیم	۱۰.۰۰
آغا حشر اور ان کے ڈرامے	〃 〃	۵.۰۰
فن افسانہ نگاری	〃	۵.۰۰
تذکرے اور تبصرے	جلیل قدوائی	۳.۰۰
تنقیدیں اور خاکے	〃 〃	۳.۰۰
تاریخ اور تنقید، اردو ڈرامہ	عشرت رحمانی	۶.۵۰
ادب شعور	ممتاز حسین	۱۰.۰۰
علمی نقوش	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں	۴.۵۰
اردو ادب میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء	الطاف فاطمہ	۵.۵۰

اردو اکیڈمی سندھ ــــ مشن روڈ کراچی

مختصر تاریخ ادبِ اُردو

مُصنّفہ

ڈاکٹر سیّد اعجاز حسین

ایم۔اے۔ڈی لٹ

★

اُردو ادب کی تاریخ، ہندوستان کی تمدّنی اور انقلابی تاریخ کے ساتھ چلتی ہے جس پر مُلک کے اکثر اہلِ قلم نے قلم اُٹھایا ہے اور اُردو میں کئی مکمل اور جامع تاریخیں موجود ہیں ــــ لیکن ڈاکٹر اعجاز حسین نے جس اختصار کیساتھ یہ تاریخ مرتّب کی ہے وہ اپنی افادیت کے لحاظ سے

★ طلبار اور اہل ذوق دونوں کے لئے یکساں طور اہم ہے ★

اور اسی لئے اساتذہ کرام اِس کے مُطالعہ کی سِفارش کرتے ہیں

چند سو صفحات میں سموئی ہُوئی زبان اُردو کی سرگذشت میں تقسیم کے بعد کا دور بھی شامل کردیا گیا ہے اور اس طرح اس چھوٹی سی کتاب کو حال و ماضی دونوں کا آئینہ کہا جاسکتا ہے۔

⊛ اُردو ادب کی ایک عظیم تاریخ ⊛ تحقیق و تنقید کی ایک گرانقدر دستاویز

⊛ سفید کاغذ اعلیٰ طباعت ⊛ مضبوط جلد ⊛ دیدہ زیب گرد پوش

قیمت ــــ سات رُوپے

اُردو اکیڈمی سندھ کراچی

قیمت دو روپے

ٹائیٹل مطبوعہ : نشاط پریس ، کراچی